برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان اسٹڈی سینٹر

جامعہ کراچی

برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات

ترتیب وتدوین: ڈاکٹر مبارک علی

جملہ حقوق محفوظ

بحقِ پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

(اس کتاب میں شامل مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ
مصنفین کے اپنے خیالات ہیں۔ ادارے کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں)

آئی ایس بی این (ISBN)	:	978-969-8791-13-1
ناشر	:	ڈاکٹر سید جعفر احمد، نگراں ڈائریکٹر، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
سرورق	:	خدا بخش ابڑو
طابع		ماس پرنٹرز
اشاعتِ اوّل		دسمبر ۲۰۰۷ء
قیمت		۲۰۰/ روپے

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
سرآغاز	ڈاکٹر سید جعفر احمد	v
پاکستان میں تاریخ نویسی اور اس کے مسائل	ڈاکٹر مبارک علی	۱
بیسویں صدی میں تاریخ نویسی: پروفیشنل مورخ	جیری اے بینٹلے /ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی	۴
تاریخ نویسی سے ہیگل کے فلسفۂ تاریخ تک	اشفاق سلیم مرزا	۱۴
سائنس کی تاریخ نویسی	ڈاکٹر انیس عالم	۳۳
عہد صوفیاء کی تاریخ کیسے لکھی گئی؟	غافر شہزاد	۴۳
سبالٹرن اسٹڈیز — محکوموں کی تاریخ	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد	۵۷
ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد میں تاریخ نویسی	ہما غفار	۷۳
آپ بیتی اور تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	۸۵
اردو میں تاریخ نویسی	ڈاکٹر مبارک علی	۹۰
اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فنِ تاریخ نگاری	ظہیر الدین ملک	۱۰۱
علاقائی تاریخ نویسی: تاریخِ گجرات کے خصوصی حوالے سے	احمد سلیم	۱۱۹

سرآغاز

زیرِ نظر مجموعہ اُن مضامین پر مشتمل ہے جو تاریخ نویسی کے موضوع پر منعقد ہونے والی پاکستان اسٹڈی سینٹر اور سہ ماہی مجلّے 'تاریخ' (لاہور) کی مشترکہ کانفرنس بعنوان 'برصغیر میں تاریخ نویسی: رجحانات اور مسائل' میں پڑھے گئے۔ یہ کانفرنس یکم نومبر ۲۰۰۶ء کو جامعہ کراچی میں منعقد ہوئی۔ یہ ایک روزہ کانفرنس اس لحاظ سے بہت کامیاب ثابت ہوئی کہ اس میں ملک کے مختلف شہروں سے تاریخ نویسوں اور تاریخ کے مضمون سے وابستہ ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ کانفرنس میں کراچی کے علمی و ادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی بہ کثرت شرکت کی، نیز جامعہ کراچی کے اساتذۂ کرام اور طلبا و طالبات بھی کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں موجود رہے۔ کانفرنس میں شریک ہونے اور مختلف اجلاسوں میں بحث و مباحثے میں حصہ لینے والوں کی تعداد ہی کانفرنس کی کامیابی کا واحد ثبوت نہیں تھی بلکہ اس کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات کا معیار، مقالات کے موضوعات اور اِن موضوعات کا تنوع اس کانفرنس کی نمایاں ترین خوبی قرار پایا اور تمام شرکاء اور سامعین نے اس امر کا اعتراف کیا۔ شرکاء کی طرف سے حوصلہ افزائی کے تبصرے ہمارے لیے باعثِ تقویت ہیں اور اِن سے ہم کو مستقبل میں اور بھی اچھی کانفرنسیں کرنے کے لیے توانائی حاصل ہوئی ہے۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی کا ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جہاں مطالعۂ پاکستان میں ایم۔اے کی سطح کی تدریس اور ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی پروگرام کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا ہے۔ سینٹر 'پاکستان پرسپیکٹیوز' کے نام سے ایک انگریزی جریدہ شائع کرتا ہے جو گزشتہ گیارہ برس سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف کتابیں بھی سینٹر سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔

تاریخ، سیاسیات، ادب، بین الاقوامی اُمورغرض پاکستان کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں چھپنے والی ان کتابوں نے اپنا ایک معیار برقرار رکھا ہے اور ہمارے لیے یہ بات باعثِ تقویت ہے کہ اہلِ علم نے سینٹر کی اِن کاوشوں کی پذیرائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

اپنی علمی سرگرمیوں کے ایک اہم حصے کے طور پر سینٹر مختلف اوقات میں بین الاقوامی یا قومی سطح کی کانفرنسیں بھی منعقد کرتا رہا ہے۔ اس کتاب میں موجود مقالے بھی ایک قومی کانفرنس ہی میں پڑھے گئے۔ یہ کانفرنس معروف علمی جریدے 'تاریخ' اور اس کے فاضل ایڈیٹر جناب ڈاکٹر مبارک علی صاحب کے تعاون سے منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ملک میں تاریخ کے بظاہر خشک مگر فی الواقع انتہائی دلچسپ اور کارآمد مضمون کو مقبول بنانے میں ایک عرصے سے منہمک ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زبان و بیان کے ذریعے تاریخ کو عام قارئین کے لیے قابلِ فہم بنایا ہے بلکہ تاریخ کی حقیقی معنویت اور اس کے زندہ علم ہونے کی حقیقت کو اُجاگر کرنے میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پچاس ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں جو بہت اچھوتے اور متنوع موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اُن کی کتابیں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں اور ملک کے دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں بھی نوجوان اُن کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اِدھر چند برسوں سے ڈاکٹر صاحب کا جریدہ ملک کی مختلف جامعات اور دوسرے اداروں کے ساتھ مل کر تاریخ کے کسی منتخب موضوع پر کانفرنسوں کا انعقاد بھی کر رہا ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں پاکستان اسٹڈی سینٹر کی جانب سے ہونے والی کانفرنس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں بھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی ٹیم کا اہم کردار تھا۔ میری خواہش پر کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالات کو ترتیب دینے اور ان کی تدوین کی ذمہ داری بھی ڈاکٹر صاحب نے قبول کی۔ اس تمام تعاون کے لیے میں اُن کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

اس کتاب کے بعض تکنیکی اُمور مثلاً حوالہ جات کی توثیق اور پروف خوانی کی ذمہ داری سینٹر کی ریسرچ اسکالر ہما غفار صاحبہ نے سرانجام دی۔ میں اس تعاون کے لیے اُن کا بھی ممنون ہوں۔

کراچی
۱۰ر دسمبر ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر سید جعفر احمد

پاکستان میں تاریخ نویسی اور اس کے مسائل

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ کسی بھی قوم یا سماج کی اجتماعی یادداشت کا نام ہے اگر اس کے حافظہ سے ان یادداشتوں کو نکال دیا جائے یا کچھ کو بحفاظت رکھا جائے اور کچھ کو مسخ کر دیا جائے تو اس صورت میں قوم کی شناخت بھی ادھوری ہو جائے گی یا بگڑ کر مسخ ہو جائے گی۔ مورخوں کا کام ہے کہ وہ اجتماعی یادداشتوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جب کہ اہل اقتدار کا کام ہوتا ہے کہ ان کو اپنے مفادات کے تحت مرتب کرتے رہیں۔ اگر مورخ اہل اقتدار کے ساتھ تعاون کر لیتے ہیں تو پھر تاریخ نویسی کی شکل بگڑ جاتی ہے اور وہ ان کا ساتھ دیتی ہے کہ جن کے پاس طاقت وقوت اور دولت ہوتی ہے۔ عام لوگ تاریخ سے نکال دیئے جاتے ہیں۔

جب تاریخ نویسی کو ان بنیادوں پر لکھا جائے تو سماج میں افراد، شخصیتوں، اور خاندانوں کا اثر ورسوخ بڑھتا ہے، انہیں ہی حکمرانی کا حق ملتا ہے، اور انہیں سے نیکی واصلاح کی توقعات کی جاتی ہیں، سماج کے دوسرے گروہ بے بس، مجبور اور لاچار ان کے رحم وکرم کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم نے سہ ماہی تاریخ کو چھاپنا شروع کیا اور اس کے تحت اب تک تاریخ پر سات کانفرنسیں کرائی ہیں، اب یہ آٹھویں کانفرنس ہے جو کراچی یونیورسٹی کے ادارے پاکستان اسٹڈی سینٹر کے تعاون سے ہو رہی ہے۔

تاریخ کے جرنل اور کانفرنسوں سے ہمارا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تاریخ کے موضوع میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان سے آگاہ کرایا جائے کیونکہ اب یہ مضمون سیاسیات تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ اس میں کلچر، معیشت اور انسانی جذبات آ گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ موجودہ حالات میں ہم ماضی کی تشکیل کس طور سے کریں کیونکہ حال کے

تقاضے ماضی کی تصویر کو بدلتے رہتے ہیں، ہمارا ایک ماضی تو وہ ہے کہ جسے ہم مسلمانوں کی تاریخ سے جوڑتے ہیں، دوسرا ماضی برصغیر کی تاریخ وتہذیب سے ہے، ان دونوں ماضیوں کو باہم کس طرح سے جوڑا جائے اور مسلمانوں کی تاریخ کو برصغیر کی تاریخ کے تسلسل سے کیسے ملایا جائے؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد پاکستان کی تاریخ نویسی کا مسئلہ ہے تاریخ کی تشکیل میں شخصیات کا کردار، دوقومی نظریہ اور مذہبی جذبات آتے ہیں۔ کیا اب اس فریم ورک کو تبدیل کر کے ہمیں نئے خطوط پر اپنی تاریخ لکھنی چاہئے، کیونکہ وقت کے ساتھ آنے والی نسلوں کے نئے خیالات وتقاضے ہیں۔ تقسیم کو وہ ایک نئے زاویئے سے دیکھ رہے ہیں، اس لئے تاریخ نویسی کو بھی اب پرانے نظریات سے نکل کر نئے انداز سے ماضی کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جدید تاریخ ۱۹۴۷ء سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تاریخ ہے۔ اس ۶۰ سال کے عرصہ میں پاکستانی سماج بدلا ہے، کیوں یہ تبدیلی آئی ہے؟ اس کے پس منظر میں کون سے تاریخی عوامل ہیں؟ ان مسائل کو سیاست کے دائرہ سے نکل کر سماجی ومعاشی وثقافتی وعلمی طور پر بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس وقت پاکستان کے سماج میں قدیم وجدید قدروں کی کش مکش اور تصادم جاری ہے، جاگیرداری، قبائلی رسم ورواج، مذہبی انتہا پسندی اور آمریت کے مقابلہ میں روشن خیال، لبرل، جمہوریت پسند لوگوں کی آوازیں بہت دھیمی ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ کیا ہمارا سماج قدامت پرستی کو پسند کرتا ہے اور اسی دائرہ میں رہنا چاہتا ہے؟ یا اس سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے، جو ان زنجیروں کو توڑے اور سماج کو آزاد کرے۔

پاکستان کی تاریخ نویسی کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس کے چار صوبے تاریخی وکلچرل طور پر اس سے زیادہ قدیم ہیں۔ ان کی علیحدہ سے اپنی تاریخ ہے، کلچر ہے، زبان ہے اور انہیں بنیادوں پر ان کی علاقائی شناخت ہے، لہٰذا قومی تاریخ اور علاقائی تاریخ کو کس طرح سے ایک دھارے میں لایا جائے تاکہ دونوں شناختیں ساتھ ساتھ چل سکیں۔

پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل بہت ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ کا مضمون اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ اس وقت پاکستان کی یونیورسٹیوں میں تاریخ کے استاد تو ہیں، مگر مورخ یا محقق نہیں ہیں۔ جو اس ذمہ داری کو اٹھا سکیں۔

اگر کراچی یونیورسٹی اس ذمہ داری کو سنبھالنے کا عزم کرے اور تاریخ کا تحقیقی ادارہ یہاں قائم ہو کہ جہاں ان مسائل پر تحقیق ہو، تو یقیناً یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ کیونکہ جب تک کسی قوم میں تاریخی شعور نہیں ہوگا، اس میں تبدیلی کی خواہش بھی نہیں ہوگی، اور یہ تاریخی شعور جب ہی ہوگا کہ قوم کے حافظہ میں مکمل تاریخی یادداشتیں ہوں، جو مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی نہ ہوں بلکہ صحت منداور تروتازہ ہوں۔

بیسویں صدی میں تاریخ نویسی: پروفیشنل مورخ

جیری اے بینٹلے/ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

ایک طرف فلسفہء تاریخ کے اسکالرز عالمی تاریخ اور ماضی کو وسیع تناظر میں دیکھ رہے تھے تو دوسری طرف سماجی علوم کے ماہرین جدید دنیا میں ترقی کے اسلوب، انداز اور ذرائع کا مطالعہ کر رہے تھے، تو ان دونوں سے علیحدہ مورخ اپنے مطالعہ کو قومیتوں اور برادریوں پر مرکوز رکھے ہوئے تھے۔ ایسا بہت کم ہوا کہ انہوں نے دوسرے علوم کے تجربات کی روشنی میں تاریخ کا تجزیہ کیا ہو۔ ان میں سے کم ہی مورخوں نے تاریخ کے ان اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہ جن سے گلوبل تبدیلیاں ہوئی تھیں۔

لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی سے پیشہ ور مورخوں پر فلسفہ تاریخ اور سماجیات کے ماہرین کی تحقیقات کا اثر ہوا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک مورخوں نے دوسرے کلچروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے روابط اور تعلقات پر گہرائی سے لکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا علم وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ابھرا۔ ۱۹۸۲ء میں ورلڈ ہسٹری ایسوسی ایشن نے مورخوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ ۱۹۹۰ء میں ورلڈ ہسٹری ایسوسی ایشن اور ہوائی یونیورسٹی پیرس نے مل کر 'جرنل آف ورلڈ ہسٹری' شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی مشہور پبلشرز نے عالمی تاریخ پر کتابوں کا سلسلہ چھاپنا شروع کیا، جس کی وجہ سے قارئین میں عالمی تاریخ کے بارے میں شوق وجستجو پیدا ہوئی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آتے آتے پیشہ ور مورخین گلوبل تاریخ کے بارے میں گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر رہے تھے۔

یہ گلوبل تاریخی تجزیہ تین خطوط پر ابھرا، اس میں انفرادی مورخ کی دلچسپی اور اس کی تجزیاتی صلاحیت کا تعلق ہے۔ ان میں ایک گروپ نے زیادہ توجہ ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ اور ان سماجوں کے بارے میں لکھا کہ جو اس سے متاثر ہوئے۔ دوسرے گروپ نے وسیع تناظر میں معاشی

اور سماجی تاریخ پر تحقیق کی خاص طور سے اس تجارت پر کہ جو دور دراز کے علاقوں سے ہوئی، اور جس کی وجہ سے پھیلے ہوئے علاقے آپس میں ملے۔ تیسرے گروپ نے ماحولیات کا مطالعہ کیا کہ جس کے علاقوں پر دیرپا اثرات ہوئے اور جنہوں نے دنیا کو جغرافیائی طور پر بدل کر رکھ دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تینوں مکتبہء فکر بالکل علیحدہ ہوں، یا ان کا ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو، اس کے برعکس ایسے انفرادی مورخ ہیں کہ جو ان تینوں مکتبہء فکر کو اپنے تجزیوں میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس طرح کسی بھی لحاظ سے ان تینوں میں بالکل علیحدگی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دوسرے کو متاثر کر رہے ہیں۔

ثقافتی روابط اور پھیلاؤ کا مکتبہء فکر

ولیم ایچ میک نیل (William H. McNeill) کی کتاب جس کا ٹائٹل ہے 'مغرب کا عروج: انسانی کمیونٹی کی تاریخ'، اس نے پیشہ ور مورخوں کو بے انتہا متاثر کیا اور اس کے زیر اثر انہوں نے عالمی تاریخ کا تجزیہ کیا۔ درحقیقت ٹوائن بی کی کتابوں نے میک نیل کو اس طرف متوجہ کیا۔ وہ ٹوائن بی کے اس تجزیہ سے متاثر ہوا کہ جو اس نے دنیا کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں مختلف دائرہ کار تشکیل دیئے تھے۔ اگرچہ اس نے ٹوائن بی کی آخری عمر میں اس کے ساتھ کام بھی کیا، مگر وہ ٹوائن بی کے ان خیالات سے متفق نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں قوانین ہیں کہ جن کے تحت تاریخی عمل چل رہا ہے، یا یہ کہ ماضی سے ایسا مذہبی یا فلسفیانہ ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو حال کے لئے قابل قبول ہو۔ میک نیل نے ابتدائی زمانہ میں ان تاریخی عوامل کا تجزیہ کیا کہ جنہوں نے وسیع پیمانہ پر براعظموں اور جغرافیائی علاقوں کو متاثر کیا، یا یہ کہ جن سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔

میک نیل کی کتاب 'مغرب کا عروج' کا اہم نقطہ مغربی تہذیب کا پھیلاؤ ہے۔ اس کی دلیل کے مطابق مختلف اقوام اور سماجوں کے درمیان رابطہ اور تعلق کلچر کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگرچہ اکثر غیر ملکیوں سے تعلقات کو سیاست یا تعلقات کے تناؤ اور دباؤ کی صورت میں دیکھا جاتا ہے، مگر اس سے بڑھ کر ان کے ملاپ سے جو خیالات و افکار میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اور کلچر کی روایات زیادہ توانائی سے تشکیل پاتی ہیں۔

میک نیل نے اپنی دوسری کتابوں میں اس نقطہء نظر کو اور زیادہ پھیلا کر بیان کیا ہے۔ مثلاً اپنی ایک کتاب 'طاعون اور لوگ' میں اس نے وبائی بیماریوں کے عالمی اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔

لوگوں کے آپس میں ملنے سے نہ صرف ٹیکنالوجی اور خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے، بلکہ اس کے نتیجہ میں لوگ ایسی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں پہلے انہوں نے سنا تک نہیں ہوتا وبائی بیماریاں ایک منظم سماج کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ مثلاً پلیگ نے نہ صرف ۱۴ ویں صدی سے ۱۷ ویں صدی تک آبادی کی اکثریت کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بلکہ اس نے تجارت کے نظام کو بھی درہم برہم کر دیا اور اس سے یورپ اور ایشیا دونوں بری طرح متاثر ہوئے۔

کچھ معاملات میں آبادی کی کمی کی وجہ سے (جو وبائی بیماری کا نتیجہ تھی) بڑی بڑی امپائر کو زوال کا خطرہ ہوا، مثلاً جب یورپی وایشیائی پلیگ کی وجہ سے قدیم شاہراہ ریشم کی تجارت اور آمد و رفت متاثر ہوئی، تو اس کی وجہ سے رومی اور ہان سلطنتوں کا زوال ہوا۔ کچھ واقعات میں آبادی کے گھٹنے کے بڑے ہی افسوس ناک واقعات ہوئے جیسا کہ سولہویں اور انیسویں صدیوں میں، چیچک اور اسی قسم کی دوسری بیماریوں نے امریکہ کے مقامی باشندوں کو بڑی تعداد میں مار دیا، جس کی وجہ سے یورپی لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ امریکہ اور جزائر غرب الہند میں آسانی سے بغیر مزاحمت کے اپنی نو آبادیاں قائم کر لیں۔ ان تمام معاملات میں بیماریوں کو پھیلانے والے لوگ ہوتے تھے، جو جراثیموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ امریکہ میں تو یہ جراثیم باضابطہ منصوبے کے تحت مقامی باشندوں میں پھیلائے گئے۔ ان کے آخر میں سیاسی، سماجی اور کلچرل اثرات ہوئے، جس نے ایک نئے نظام کو پیدا کیا۔

'طاقت کی تلاش' نامی کتاب میں میک نیل نے اپنے نقطۂ نظر کو محدود موضوعات سے ہٹا کر وسیع تناظر میں تاریخی عمل کو دیکھا ہے کہ کس طرح سے ادارے اور طبقات زائد پیداوار کو لوگوں سے ہتھیا کر اسے اپنی طاقت اور اقتدار کے استحکام میں استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور سے اس مقصد کے لئے ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے ایک نظام کو تعمیر کرتے ہیں، میک نیل خاص طور سے کانسی اور لوہے کی تہذیبوں کی ٹیکنالوجی کی وضاحت کرتا ہے کہ جن میں رتھوں کا استعمال، بارود، توپ خانہ، بندوقیں، فوج کی ترتیب و تنظیم، اور جنگ کو تجارتی اور مالی مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔ لہٰذا ہر دور میں کہ جب ٹیکنالوجی میں ایجادات ہوئیں، تو مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں نے ان لوگوں کو طاقت ور بنایا کہ جن کے پاس یہ تھی۔ اس طرح ہر ایسے دور میں ہمسایوں کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ اس ٹیکنالوجی کو حاصل کر لیں، اس طرح مہارت اور پیشہ

ورانہ صلاحیتیں تیزی سے اس علاقے میں پھیلتی ہیں۔

میک نیل کے اس نقطہ نظر کی تردید یا توثیق سے گریز کرتے ہوئے بہت سے مورخوں نے ٹیکنالوجی اور اس کے کردار پر روشنی ڈالی ہے کہ جس کی وجہ سے بنیادی سماجی تبدیلیاں ہوئیں۔

'عہد وسطی میں ٹیکنالوجی اور سماجی تبدیلی' نامی کتاب میں لین وائٹ جونیر (Lynn White Jr) نے نشاندہی کی ہے کہ ایشیا میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی جب یورپ میں روشناس ہوئی تو اس کے بہت زیادہ سماجی وسیاسی اثرات ہوئے۔

اسی ضمن میں لنڈا شیفر (Lynda Shaffer) کا مقالہ جس کا عنوان ہے 'جنوبی بنانا' میں یہ دلیل دی ہے کہ ۵ ویں صدی عیسوی میں، جو ٹیکنالوجی ہندوستان اور جنوب مشرق ایشیا میں ایجاد ہوئی تھی، اس نے چین اور بحر روم کے علاقوں پر اثرات ڈالے آرنلڈ پے سی (Arnold Pacey) نے اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا کہ ٹیکنالوجی کا محض تبادلہ نہیں ہوا، بلکہ اس نے تہذیبوں کے درمیان بحث ومباحثہ کی داغ بیل ڈالی۔

دوسرے مورخوں نے ٹیکنالوجی کے ان پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جن کی وجہ سے عالمی صورت حال تبدیل ہوئی، ڈینیل ہیڈرک (Daniel Headrick) نے امپیریل ازم کے پھیلاؤ میں ٹیکنالوجی اور اس کے آلات واوزار کا مطالعہ کیا ہے، اس میں ٹیلی کمیونی کیشن اور امپیریل ازم کے درمیان باہمی تعلق کی وضاحت کی ہے کہ جس نے امپیریل طاقتوں کو معلومات فراہم کیں اور جس کی وجہ سے یورپی اثر ورسوخ دنیا میں تیزی سے پھیلا۔

ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ مورخوں نے یورپی فوجی تربیت، ڈسپلن اور ہتھیاروں کے بارے میں بھی دریافت کی ہے کہ اس سے متاثر ہوکر روس، چین، جاپان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں نے اس ماڈل کو اختیار کیا اور اپنی فوجوں کو انہیں خطوط پر تربیت دی اور انہیں ہتھیاروں کا حصول کیا۔

رچرڈ ڈبلیو بلیٹ (Richard W. Bulliet) نے اپنی کتاب 'اونٹ اور پہیہ' میں ان وسائل کی ٹیکنالوجی پر بحث کی ہے۔

آگے چل کر خود میک نیل نے 'مغرب کے عروج' پر اپنی تحریروں پر تنقیدی نظر ڈالی اور یہ تسلیم کیا کہ اس نے عالمی تاریخ کے تناظر میں افریقہ کے تجربات کو شامل نہیں کیا اور یہ کہ اس نے

تاریخ نویسی میں زیادہ تر حکمراں طبقوں اور امراء کی سرگرمیوں کو نظر میں رکھا، جب کہ شکست خوردہ اور محروم لوگوں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور یہ کہ اس نے چین میں معیشت کے ابھار اور اس کی ٹیکنالوجی میں ایجادات پر نظر نہیں ڈالی، جو کہ ایک سے پندرہ ہزار کے درمیان ہو رہی تھیں۔ مارشل ہوبسن اور ایڈمنڈ برک نے ان خدشات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جو تاریخ میں 'یورپی مرکزیت' کی وجہ سے، تاریخی عمل کو سمجھنے میں دشواری پیدا کرتے ہیں، کیونکہ 'مغرب کے عروج' میں ان تمام عناصر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جو تہذیبوں کے اشتراک کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

میک نیل کی تحریریں تاریخی عمل کو وسیع نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرتی ہیں جس کی وجہ سے یہ پروفیشنل مورخوں کے لئے باعث دلچسپی ہے، لیکن اس کے ہاں جو کمی ہے وہ یہ کہ ان سماجی قوتوں کا ذکر نہیں کرتا ہے کہ جو تاریخ کی تشکیل میں عمل پیرا ہوتی ہیں۔

اگر چہ پروفیشنل مورخوں نے میک نیل کی سطح پر اس وسعت کے ساتھ عالمی تاریخ کا تو تجزیہ نہیں کیا، جیسا کہ اس نے 'مغرب کے عروج' میں کیا ہے لیکن انہوں نے ان دوسرے سماجی علوم کی روشنی میں ان چیلنجوں کا جواب دیا ہے کہ جو عالمی تہذیب میں مختلف علاقوں اور مختلف کلچروں کو درپیش ہیں، اس کی وجہ سے انہوں نے عالمی تاریخ کو سمجھنے کی نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ خاص طور سے انہوں نے کسی ایک علاقہ پر توجہ مرکوز کر کے اس کی تاریخ اور کلچر کی وضاحت کی ہے اور ان عناصر کی نشان دہی کی ہے جو قومی اور کلچرل خطوط سے باہر اثر انداز ہوتے ہیں۔

معاشی اور سماجی تاریخ نویسی

اس دوران عالمی تاریخ کو معاشی اور سماجی نقطۂ نظر سے لکھنے والوں کی ایک جماعت ابھری جنہوں نے تجارت کے ذریعہ جو دنیا کے علاقوں میں قربت پیدا ہوئی تھی، اسے اجاگر کیا، خاص طور سے سمندروں کے ذریعہ جو تجارتی روابط تھے، ان پر زیادہ توجہ دی، جن مورخوں نے ان موضوعات پر لکھا وہ خاص طور سے جغرافیہ کے ان پہلوؤں سے متاثر ہوئے کہ جن کا تعلق انسانی ارتقاء اور رشتوں سے تھا، اور ان نظریات سے سیکھا کہ جن میں شہروں کے قیام، ارتقاء اور ترقی اور زوال کا ذکر ہے۔ انہوں نے جہاں ماحولیات، آب و ہوا، اور جغرافیائی حالات کا تجزیہ کیا، اسی کے ساتھ سیاسی و سماجی اور کلچرل عوامل کو بھی ان کی روشنی میں بیان کیا اور ان تبدیلیوں کی نشان دہی کی کہ جو

اس پر عمل کی وجہ سے ہوئیں۔

مثلاً اس ضمن میں کے، این چودھری کی کتاب 'تجارت اور تہذیب: بحر ہند کی معاشی تاریخ، اسلام کے عروج سے ۱۷۵۰ء تک' ایک اہم کتاب ہے۔ اس کی دوسری کتاب 'ایشیا یورپ سے پہلے: معیشت اور تہذیب بحر ہند میں' ان کے ذریعہ چودھری نے بتایا ہے کہ بحر ہند کی تجارت نے موجودہ دور سے پہلے تجارت کے ذریعہ کس طرح سے اردگرد کے علاقوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ چودھری نے ان کتابوں میں برودل کی مشہور کتاب 'بحر روم' کے اس تھیسس سے استفادہ کیا ہے کہ جس میں برودل نے لکھا ہے کہ تجارت نے کس طرح سے یورپ، شمالی افریقہ، اور ایشیا کے ملکوں کو تجارت کے ذریعہ ملا دیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بحر ہند تجارت کا ایک بڑا مرکز تھا، جس کے تجارتی راستے دوسرے علاقوں اور ملکوں کی منڈیوں سے جڑے ہوئے تھے، جن اشیاء کی تجارت ہوتی تھی، ان میں ٹیکسٹائل، لوہا، اور مٹی و چینی کے بنے برتن شامل تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحر ہند کی تجارت پوری طرح سے اردگرد کے ملکوں اور علاقوں پر اثر انداز ہو کر انہیں باہم ملا رہی تھی۔

جیسا کہ چودھری نے بحر ہند اور اس کی تجارت کا مطالعہ کیا، وہیں فلپ ڈی کرٹن (Philip D. Curtin) نے بحر اوقیانوس اور اس کی تجارت پر تحقیق کی۔ اس کی تحقیق کی خاص بات یہ ہے کہ اس نے بتایا ہے کہ جدید عہد کے شروع ہوتے ہوتے اوقیانوس سمندر نے چاروں براعظموں کے لوگوں کو سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ 'اوقیانوس میں غلاموں کی تجارت' میں اس نے غلاموں کی تجارت اور ان کی تعداد پر گہرا مطالعہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تجارت کی وجہ سے ابتدائی جدید دور میں اوقیانوسی دنیا کس طرح سے باہم مل رہی تھی۔ اس نے ان غلاموں کے بارے میں تحقیق کی کہ جنہیں افریقہ سے لایا جاتا تھا، ان راستوں اور جگہوں کی نشان دہی کی کہ جہاں سے وہ گذرتے اور قیام کرتے تھے۔ 'اٹلانٹک کمپلیکس کا عروج و زوال' نامی مقالے میں، اس نے اوقیانوس سمندر کی تاریخ لکھی ہے، اس میں غلاموں کی تجارت کے ساتھ ساتھ شکر اور دوسری اشیاء کی تجارت کا بھی ذکر ہے۔ ٹرانسپورٹ، ماحولیات اور سرمایہ داری کے ابھار وہ عناصر تھے کہ جنہوں نے اوقیانوسی دنیا کے لوگوں کو باہم ایک دوسرے کے قریب کیا۔ اس طرح کرٹن کے مطالعہ نے اوقیانوس کی سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت کے بارے

میں مفید معلومات فراہم کیں۔

'عالمی تاریخ میں کلچرل تجارت کا ملاپ' میں کرٹن نے اٹلانٹک کے مطالعہ سے آگے بڑھ کر اور زیادہ وسعت کے ساتھ اس پہلو پر توجہ دی کہ تجارت اور کلچر کا انسانی تجربات پر کیا اثر ہوا۔ اس میں ان تاجروں، ایجنٹوں، بروکرز اور براداریوں کا ذکر ہے کہ جو اپنے علاقوں سے دور دوسرے ملکوں میں آباد ہوئے یا وہاں کے تجربات حاصل کئے۔ اس سے مختلف عناصر میں جو ہم آہنگی ہوئی، اس کے کیا نتائج نکلے، کرٹن اس مطالعہ سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تاجر جو اپنی سرحدوں اور کلچر کی حدود سے نکل کر دور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، دراصل وہ آریائی کلچروں کے ملاپ کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

کرٹن کے کام کا اثر تاریخ نویسی پر اس کی اپنی تحریروں سے بھی ہوا اور بعد میں اس کے شاگردوں نے اس میں مزید اضافہ کیا، کیونکہ اس نے اپنے شاگردوں سے عالمی موضوعات پر تحقیق کرائی، انہوں نے 'وس کانسن اسکول اور گلوبل ہسٹورین' کے نام سے تحقیق میں بڑا کردار ادا کیا اس کے بعد مورخوں کی ایک بڑی جماعت نے اس موضوع پر تحقیق کر کے اس کے اور بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

ماحولیات کی تاریخ

اس کے بعد مورخوں کی ایک جماعت تھی کہ جنہوں نے گلوبل تناظر میں ماحولیات کی تاریخ لکھتے ہوئے جائزہ لیا کہ اس کے دنیا کے مختلف علاقوں اور براعظموں پر کیا اثرات ہوئے۔ انہوں نے تاریخ کی ابتداء اس زمانے سے شروع کی کہ جب ابتدائی دور میں انسانوں کے گروہ آزادی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور لمبے لمبے فاصلے طے کرتے تھے۔ اس ہجرت کے عمل میں وہ اپنے ساتھ نئے درختوں، جانوروں اور فصلوں کے ساتھ نئی نئی بیماریاں بھی لے جاتے تھے کہ جن کی وجہ سے نئے آباد ہونے والے علاقوں کی آبادی اور ماحول ان سے متاثر ہوتا تھا۔ انہوں نے قدیم تاریخ کے اس عمل کو موجودہ دور کے ہجرت کے عمل اور آبادی کے منتقل ہونے سے جوڑ کر اس کا تجزیہ کیا اور اس کے گلوبل تاریخ پر جو اثرات ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

الفرڈ ڈبلیو کروزبی (Alfred W. Crosby) نے اپنی کتاب میں ان عناصر کا تجزیہ

کیا ہے کہ جو کولمبس اور اس کے ساتھیوں کی امریکہ میں آنے کے بعد اس کے ماحول پر ہوا۔ اس کی کتاب کا ٹائٹل ہے: 'The Columbian Exchange' ۱۴۹۲ء میں اس کے بعد سے ماحولیات میں جو تبدیلیاں آئیں، ان پر تحقیق کرتے ہوئے اس نے تبادلہ کے بارے میں لکھا کہ آلو، تمباکو اور کوکا امریکہ سے پوری دنیا میں پھیل گئے، جب کہ یورپ کی بیماریاں اور موسیقی نئی دنیا میں آ گئے۔

کروزبی نے اپنے ایک مقالہ 'ماحولیاتی امپیریل ازم' میں ۹۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک یورپ کا جو پھیلاؤ ہوا ہے اس کا تجزیہ کیا ہے کہ وہ کیا وجوہات تھیں کہ یورپی پودے، درخت اور کمیونٹیز دنیا کے وسیع اور بکھرے ہوئے علاقوں میں جڑ پکڑ گئیں۔ جب کہ دوسرے ملکوں میں یہی چیزیں اتنی تیزی کے ساتھ نہیں پھیلیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ یورپ کی ان چیزوں کے پھیلنے میں خاص عوامل شامل تھے۔ مثلاً یورپی بیماریوں نے امریکہ کے قدیم باشندوں پر تباہ کن اثرات ڈالے، جب مقامی آبادی کم ہوئی تو یورپی آبادکاروں کو آباد ہونے کے لئے وسیع اور پھیلی ہوئی زمین مل گئی جہاں انہوں نے اپنی پسند کی فصلوں کو بویا۔ جب وہ اپنے ساتھ یورپی مویشی، جن میں گھوڑے اور سوروں کے ریوڑ شامل تھے لائے تو ان کے مقابلہ میں یہاں کوئی نہیں تھا، اس لئے ان کی افزائش نسل خوب ہوئی۔ جب ان کو مقامی درختوں اور پودوں کی غذا کھلائی گئی، تو اس کے نتیجہ میں ماحولیات کا وہ توازن بگڑ گیا کہ جو اب تک قائم تھا۔ کیونکہ اب ضرورت سے زیادہ استعمال نے صورت حال کو تبدیل کر دیا اور ایک 'نیا یورپ' اس کے نتیجہ میں ابھرا۔ اس کے تناظر میں مورخوں نے اس یورپی تسلط کا جائزہ لیا ہے جو آہستہ آہستہ گلوبل ہو گیا۔

اسی سلسلہ میں مورخین نے ایسے موضوعات کو چنا کہ جنہوں نے سرحدوں کو پار کر کے گلوبل تبدیلیاں کیں۔ ان میں ان بیماریوں پر تحقیق ہے کہ جو ملکوں اور براعظموں میں پھیلیں۔ زراعت میں جو تبدیلیاں آئیں، ان کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ان کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ ان کی غذا کیسے بدلی، ان کی فصلوں کی پیداوار کس طرح متاثر ہوئی اور آخر میں ان کا ان کی معاشی زندگی پر کیا اثر ہوا۔

مورخین نے اس پہلو کا تجزیہ بھی کیا کہ جب یورپی اقوام گرم آب و ہوا کے ملکوں میں

گئیں تو ان کے لئے اس ماحول میں رہنا کس قدر مشکل تھا۔ اس لئے ان کی بڑی تعداد موسم کی تبدیلی کی وجہ سے جلد ہی موت سے ہم کنار ہو جاتی تھی، یہ وہ قیمت تھی کہ جو یورپی امپیریل ازم نے اپنی وسعت کی خاطر دی۔ اس تحقیق سے بہر حال یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب دو کلچروں کے درمیان تصادم یا اشتراک ہو تو اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ اس سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ جب ایسی صورت حال ہو تو وہ باہمی تعلقات کیسے قائم کرتے ہیں؟ وہ کیسے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر ایک دوسرے سے سمجھوتہ کرتے ہیں؟ کیسے فوجی طاقت اور اقتدار آپس کے سمجھوتوں اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے؟ کیا وجوہات ہوتی ہیں کہ افراد اپنا وراثتی کلچر چھوڑ کر ایک غیر ملکی کلچر کو اختیار کر لیتے ہیں؟ مختلف کلچر جو کہ اجنبی کلچر سے فوجی یا سماجی طور پر شکست کھا کر پس منظر میں چلے جاتے ہیں، وہ کس طرح دوبارہ سے ابھرتے ہیں اور اپنی روایات کا احیاء کرتے ہیں؟ اور ایک غیر ملکی اور اجنبی کلچر کیوں اور کس طرح جڑ پکڑ لیتا ہے اور مقبوضہ سماج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے؟ ان سوالات کے جواب مورخوں نے دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلہ میں کچھ ماہر علم بشریات (انتھروپولوجسٹ) اور مورخوں نے اس کا تجزیہ چھوٹے جزیروں اور وہاں کے کلچرل تصادم سے کیا کہ جو یورپیوں کی آمد سے ہوا۔ جیسے جزائر غرب الہند میں، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ چھوٹے جزیروں کے لوگ اپنی روایات، قدروں، اور رسومات کو یورپی کلچر کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ برقرار نہیں رکھ سکے، کیونکہ ان میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ وہ یورپ کی ٹیکنالوجی، فوجی طاقت، معاشی برتری، اور کلچرل روایات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس طرح ان کا کلچر خستہ ہو کر ختم ہو گیا اور بہت کم نشانیاں چھوڑ گیا۔

یہی صورت حال جنوبی امریکہ میں مایا تہذیب کی ہوئی کہ جسے ہسپانوی فاتحین نے شکست دے کر مٹا دیا، یہی صورت حال شمالی امریکہ اور یورپیوں کے درمیان ہوئی کہ جنہوں نے مقامی کلچر کا نام و نشان باقی نہیں رکھا۔

اسکالرز نے ان انفرادی شخصیات اور ان کی زندگیوں پر بھی کام کیا ہے کہ جن لوگوں نے بحیثیت مترجم، گائڈ، یا رابطہ و تعلق کے مقامی لوگوں اور غیر ملکیوں کے درمیان کام کیا۔ ان کے تجزیہ کے مطابق یہ افراد نہ صرف اپنے لوگوں سے کٹ گئے، بلکہ غیر ملکیوں نے بھی انہیں اجنبی ہی سمجھا، اس صورت حال میں ان کی نفسیاتی کیفیت ایک بحران میں مبتلا رہی۔

ایک دوسرے موضوع پر جس پر توجہ دی گئی وہ یہ ہے کہ یورپی امپیریل طاقتوں نے جن قوموں پر اپنا تسلط قائم کیا، ان کے بارے میں جو خیالات قائم کئے وہ ان کی ٹیکنالوجی اور فوجی قوت کی بنیاد پر تھے۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ اسکالرز نے دونوں کے درمیان کلچرل تصادم کا تجزیہ کیا ہے کہ جو یورپی قبضہ کے بعد پیدا ہوا، اور جس نے مقبوضہ سماج کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک اور اہم موضوع جو حال ہی میں مقبول ہوا ہے وہ عورتوں کی تاریخ ہے، چونکہ یہ ابھی نیا نیا موضوع ہے، اس لئے اسے گلوبل تناظر کے بجائے قومی اور علاقائی پس منظر میں لکھا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں گرڈا لرنر (Gerda Lerner) کی دو کتابیں 'پدرانہ نظام کی پیدائش' اور 'نسوانی شعور کی پیدائش' اس میں عہد وسطیٰ سے لے کر ۱۸ رویں صدی تک کی تاریخ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے اسکالرز نے عورتوں کی تاریخ کے دوسرے پہلوؤں پر تحقیق کی جس کی وجہ سے اب اس پر کافی مواد ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان ملکوں کی عورتوں پر بھی کام ہوا ہے کہ جو یورپی کولونیل ازم کے تسلط میں تھیں۔

اس پورے عرصہ میں تاریخ نے خود کو بہت پھیلایا ہے اور دوسرے مضامین، ان کی تحقیق، اور تحقیق کے نئے طریقوں اور ذرائع کو استعمال کیا ہے۔ ان مضامین میں سوشیالوجی، انتھراپولوجی، ادب، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے ان گروپوں اور جماعتوں کو بھی تاریخ کے دائرے میں لے لیا ہے کہ جو اب تک فراموش شدہ تھے۔ تاریخ کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اقوام اور ممالک ایک دوسرے کو سمجھیں، اور گلوبل کلچر کی تحقیق میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

تاریخ نویسی سے ہیگل کے فلسفۂ تاریخ تک

اشفاق سلیم مرزا

عام معنی میں تاریخ کسی خاص دور کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ قلم بند کرنے کا نام ہے۔ اِس کا دائرہ کار ایک چھوٹے سے علاقے سے لے کر عالمگیر سطح کا ہوسکتا ہے۔ اس میں عمومی طور پر یہ قید بھی نہیں ہے کہ یہ واقعات کا سادہ طور پر مسلسل بیان ہے یا پھر کسی نظریہ یا فلسفہ کی بنیاد پر واقعات کی تعبیر کی گئی ہے۔ تاریخ لکھنے کے اِس عمل کو تاریخ نویسی کہا جاتا ہے۔

اکثر کہا یہ جاتا ہے کہ تاریخ نویسی کا آغاز اُس وقت ہوا جب ماضی میں ہونے والے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اہم نوعیت کے واقعات جنہوں نے انسانی تاریخ پر انمٹ نقش چھوڑے لوگوں کے ذہنوں میں عرصہ دراز تک محفوظ رہنے کے بعد قلم بند ہوئے۔ اگر وہ باضابطہ طور پر نہیں تو پھر بھی ایک تہذیبی میراث کے طور پر تاریخ کا حصہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں انہیں تحریری طور پر محفوظ کر لیا گیا۔ اِس میں رِگ وید کے علاوہ دوسری ویدیں، دیگر ہندوستانی مذہبی ادب، دیومالائی ادب روایتی حوالے سے مقدس مذہبی کتابیں سب ایسے ادب کا حصہ ہیں جو مشرق اور مغرب کے ثقافتی حوالوں کے طور پر ہمارے زبان و بیان میں رچ بس گئے ہیں ایسے ادب کو عام طور پر تاریخ کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے روایتی قسم کے تاریخ دان بعض واقعات کی تصدیق کے لئے حتمی طور پر اُن حوالوں میں ہی پناہ لیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک پھر اِن کا معتبر ہونا مزید مستحکم ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر اس مفروضے پر بہت سے اساطیری اور مقدس مذہبی ادب کی بنیاد رکھی جائے کہ اِس حوالے سے جو کچھ بھی زبانی یا بعد ازاں تحریری طور پر ترتیب پایا وہ دراصل انسانی ذہن کی اختراع تھا۔ تو پھر اِس مفروضے کے ماننے والوں کے حوالے سے اُن کی مغائرت ختم ہو جاتی ہے۔

اور ایسا تمام ادب مختلف ادوار میں کائنات کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے مختلف خطوں میں چلتے پھرتے انسانوں نے پیدا کیا۔ یہ انسان کا اولین World View تھا جو ایسے ادب کی شکل میں سامنے آیا۔ جسے ہم اساطیری ادب یا مذہبی ادب کہہ کر طاقچے میں رکھ دیتے ہیں۔ لیکن اگر اُسے انسانی ذہنی کاوش سمجھا جائے تو پھر تمام اساطیری کہانیاں، دیومالائیں مذہبی ادب اور صحیفے تاریخ نویسی کے ضمن میں آتے ہیں۔

لیکن اِس بات کو چند مثالوں سے واضح کرنا ہوگا تاکہ اُوپر جو بات کہی جارہی ہے۔ اُس کو مزید مستحکم کیا جاسکے۔ ہم برصغیر جنوبی ایشیا میں قدیم ہندو پاک کے مذہبی ادب سے ہی بہت قریبی مثال دے سکتے ہیں۔ رِگ وید جو اِس خطے کی سب سے قدیم مذہبی کتاب سمجھی جاتی ہے اُس کا اپنا ایک جغرافیائی وقوف ہے جو کہ سپت سندھو کے علاقے میں مختلف دریاؤں اور خطوں سے عبارت ہے اِن خطوں میں بسنے والے مقامی باشندوں اور آریائی قبائل کی تفصیل اِس میں ملتی ہے۔ پھر دس راجن یدھ یعنی دریائے راوی (ویدی دور کا پروشنی یا ایراوتی) کے کنارے دس راجاؤں کی جنگ میں جن قبائل نے حصہ لیا اُن کے حسب ونسب کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ہم آج کی مختلف ذاتوں سے اُن کا رشتہ ملانے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔

پھر ویدوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قربانی کی رسومات کو ادا کیسے کرنا ہے۔ کون سے حصے دیوتاؤں کی نذر کرنے ہیں۔ اور قربانی کی رسومات میں مختلف پجاریوں کے کیا مدارج اور کردار ہیں۔ ایک چرواہی (Pastoral) اور پدرسری (Patriarchal) نظام میں سربراہ اور باپ کا دائرہ اثر کیا ہوتا ہے مرد اور خواتین کی سماجی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔ مقامی باشندوں کو نئے آنے والے کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کے تعصّبات کیا ہوتے ہیں۔ اُن کا ناک نقشہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں ہم ویدوں سے اخذ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن سے یہ بھی وقوف حاصل کرلیتے ہیں کہ اُس زمانے میں یعنی رِگ ویدی دور میں نجی جائیداد کا تصور کیا تھا۔ زمین کی ملکیت کا ذاتی تصور موجود تھا یا نہیں۔ کیونکہ رِگ وید میں اِس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ ہمیں یہاں دیوتاؤں کے درجات کے علاوہ انسانی ضروریات اور خواہشات کا بھی علم ہوجاتا ہے۔ اِس بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اُنہیں کیا پسند تھا اور کیا ناپسند دیوتاؤں سے مناجاتوں میں جو مانگا جاتا تھا وہ سب دعائیں اِس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔

اِس طرح ہومر نے ایلیڈ میں جو ٹرائے (Troy) کا ذکر کیا تھا۔ اُس سے منسوب داستانیں ابھی تک مغربی ادب کا اہم باب ہیں۔ اور زبانِ زدِ عام ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ایسی ہی حقیقی ہیں جیسا کہ دوسری دستاویزی حقیقتیں۔ اِس کی کھوج میں بہت سے ماہر آثاریات سولہویں صدی سے اِس کاوش میں لگے ہوئے تھے کہ اُس کو کھود نکالیں حصارلک (Hisarlik) کی پہاڑیوں میں سب سے پہلے ایک فرانسیسی سیاح پیرے بیلون (Pierre Belon) نے ۱۵۵۳ء میں یہ کام شروع کیا۔ لیکن مصمم ارادے کے ساتھ یہ کام ایک جرمن تاجر ھینرک شلائی من (Hernrich Schliemann) نے ۱۸۶۸ء میں شروع کیا۔ اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے پھر ایک جرمن ماہرِ آثار قدیمہ بھی اُس کے ساتھ ہو گیا۔ اِس طرح اُنہوں نے ٹرائے دوئم کے جو آثار دریافت کئے اُن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ شاید پریام (Priam) کا شہر دریافت کر لیا گیا ہے جہاں ہیکٹر (Hector)، پیرس (Paris) اور انڈروماخی (Andromache) رہتے تھے اور جہاں پیرس یونان سے ھیلن کو لے کر آیا تھا جو جنگ ٹرائے کا باعث بنی تھی۔

لیکن شلائی من کی موت کے بعد بھی دریافت جاری رہی اور ماہرین آثار قدیمہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ اصل ٹرائے جس کا تعلق ہومر کی کہانی سے تھا ٹرائے دوئم نہیں بلکہ بعد میں ملنے والا ٹرائے ششم ہے اور لوگ اُسی کو اب ایک حقیقت مانتے ہیں۔ یعنی ٹرائے ششم ہی ایلیم (Illium یا Illios) ہے۔

ایسی ہی کچھ باتیں دنیا بھر کی دوسری اساطیری کہانیوں سے بھی وابستہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریر میں آ جانے کے بعد وہ تاریخ نویسی کے ضمن میں آ گئی ہیں۔

لیکن بعض ماہرین علم تاریخ اِس قسم کی تاریخ نویسی کو تاریخ کے دائرہ کار سے باہر ہی رکھتے ہیں۔ اُن میں کولنگ ووڈ (Collingwood) بھی شامل ہے۔ وہ بہت سی ایسی لوحوں یا دیواروں پر کندہ تحریروں کو جن میں مختلف حکمرانوں کا دیوتاؤں سے ربط یا فیصلے لینے یا مصالحتوں کا ذکر ہے تاریخ ہرگز نہیں مانتا۔ بلکہ وہ اُنہیں تاریخ سے مماثلت رکھتی ہوئی کوئی چیز گردانتا ہے۔ اُس کے نزدیک ایسی لوحیں اُن خیالات کا اظہار کرتی ہیں جنہیں کوئی بھی جدید تاریخ دان تاریخ نہیں کہے گا۔[1] وہ اِس کی کئی ایک وجوہات گنواتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اِن میں سائنسی کردار کی کمی ہے۔ کیونکہ ایسی تحریریں اُن سوالوں کے جواب مہیا نہیں کرتیں جن کے بارے میں قاری لاعلم

ہے۔ یہ صرف اُن باتوں کا ریکارڈ ہے۔ جن حقیقتوں کے بارے میں لکھنے والا پہلے ہی سے جانتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اِن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ انسانوں کی بجائے دیوتاؤں کے بارے میں ہے۔ اور اِن میں جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے وہ الوہی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اِن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بنیادی طور سے انسان کی انسان سے متعلق علمی آگاہی نہیں ہے بلکہ انسان کی دیوتاؤں کے بارے میں آگاہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کولنگ ووڈ کے ذہن میں یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ وہ دیوتاؤں کے بارے میں علم اور انسان کے بارے میں علم میں تفریق کر رہا ہے۔ اُسے ایسا کرنا بھی چاہئے۔ کیونکہ مختلف علوم خصوصاً فلسفہ، تاریخ اور الٰہیاتی کے حوالوں سے یہ تفریق روایتی طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اگر اُس مکتبِ فکر کی نظر سے دیکھا جائے جو دیوتاؤں کے بارے میں ہر قسم کے علم کو انسانی ذہن ہی کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ میری مراد فائرباخ (Feuerbach) اور باقی مادی مفکروں سے ہے تو پھر اِس قسم کے فکر میں ایک معکوسی تبدیلی آجاتی ہے کیونکہ جیسا کہ رِگ وید کے حوالے سے پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں کا ہونا یا نہ ہونا بھی انسان سے متعلق ہے۔ لیکن اِن کندہ لوحوں اور صحیفوں کے متن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پھر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تمام دیوتا انسان کی فلاح و بربادی یا تعمیر و تخریب کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اور انسان انہی حوالوں سے اُن کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ رِگ وید کہ اِن دو مصروں میں کہا گیا ہے۔

'Didst Crush the noseless Dasyus with thy weapon,
And in their home didst over throw the fiend voiced'.

'تم اپنے ہتھیار سے چپٹی ناک والے داسیو کو کچل کر رکھ دیتے ہو۔
اور شیطانی آوازوں کو اُن کے گھر میں ہی پچھاڑ دیتے ہو۔'[۲]

یہ بات وہ اِندر کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ جو دیسی داسیوں کو ہر مرحلہ پر شکست دینے کے لئے اُن کے ساتھ ہے۔ اور آریاؤں کی داسیو پر فتح مندی کی نوید کو لے کر آگے آگے چلتا ہے۔

ایلیڈ میں پوسیڈون دیوتا ٹروجن کے خلاف یونانیوں کی مدد کو آتا ہے۔[۳] ٹروئے کی

جنگ میں تو دیوتاؤں کی جانبداری واضح ہے۔ دیوتا اپالو کے علاوہ پیرس کو کون بتا سکتا تھا کہ اکلیس کی ایڑی میں تیر مارنا ہے۔ اِن تمام کہانیوں میں دیوتا انسانوں کے کہنے پر اُن کی مدد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن اکثر ایسی اساطیری کہانیوں کو تاریخ کا حصہ نہیں مانا جاتا۔ لیکن اوپر جو کچھ کہا گیا ہے۔ یعنی کولنگ ووڈ کے موقف کے حوالے سے بہت سے تاریخ دان اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ بَری کہتا ہے کہ اِس سے بہت پہلے کہ تاریخ تحریری طور پر سامنے آئی۔ قدیم یونانیوں کے ہاں ایسا ادب رزمیہ نظموں کی شکل میں موجود تھا جو تاریخ کے مماثل تھا۔[۴]

یہی بات مصری اور سومیری ادب پر بھی لاگو آتی ہے۔

روایتی تاریخ نویسی کا آغاز

مغرب کے زیادہ تر تاریخ نویس یونانی تاریخ نویسوں ہیکاٹیوس اور ہیرو ڈوٹس (Hecateus and Herodotus) سے تاریخ نویسی کا آغاز کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک تاریخ کا اصل آغاز اِنہی سے ہی ہوا۔ ہیگل نے تاریخ نویسی کے جو تین ادوار گنوائے ہیں اُن میں سب سے پہلا دور ابتدائی تاریخ کا ہے جسے وہ (Original History) یا ابتدائی تاریخ کہتا ہے۔ اِس لحاظ سے کولنگ ووڈ اور ہیگل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہیگل تاریخ نویسی کے اِن ادوار کو منہاج (Method) کہتا ہے۔

ہیگل اور ابتدائی تاریخ نویسی (Original History)

ہیگل تاریخ کے اِس منہاج کی بات اُس کی مستند مثالوں سے شروع کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک اِس کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیروڈوٹس (Herodotus) اور تھوکوڈائیڈیز (Thucydides) ہیں۔ اِس منہاج کے تحت ایسے کارنامے، واقعات اور سماج کی مختلف حالتیں قلم بند ہوتی ہیں جنہیں تاریخ نویس اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف انہی مناظر کو تاریخ کی شکل دیتے ہیں جو اُن کے گرد رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔ اِس طرح ایک خارجی وقوعہ ایک شخصی بیانیے یا تعقل میں ڈھل جاتا ہے۔

اِس منہاج سے تعلق رکھنے والے تاریخ نویس خبریت کے دوسرے ذرائع بھی بروئے

کارلاتے ہیں۔ جس طرح ایک شاعر اپنے کلام میں ماضی کے ذخیرہ الفاظ کو استعمال کرتا ہے اُسی طرح تاریخ نویس گزرتے ہوئے لمحوں کو مستقبل کے لئے یادداشت کے مندر میں محفوظ کر لیتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک قصے، داستانیں، حکائتیں اور روایتیں اِس ضمن میں نہیں آتیں۔ کیونکہ وہ اُن اقوام کی اختراع تھیں جن کی ذہانت ابھی نیم خوابیدہ تھی۔

یہ تاریخ دان حالات، کارناموں اور معاشرے کی مختلف پرتوں کو جن میں وہ بس رہے ہوتے ہیں اپنے لئے ایک وقوفی صلاحیت میں بدل لیتے ہیں۔ اِس منہاج کے تحت لکھنے والے کیونکہ ہم عصر دور کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ اِس لئے وہ خود بھی اِس میں گم ہوتے ہیں اور اِس طرح اُس کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں اُن کا کردار وقائع نگار سے آگے نہیں بڑھتا اور اُن کا ذاتی مشاہدہ آنے والی نسلوں کے لئے صرف ایک حوالے کی صورت میں رہ جاتا ہے وہ اپنے دور کے واقعات کو من وعن بیان کر دیتے ہیں۔ اُن پر غور وفکر اُن کے بس میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ فکر کی اُس منزل تک ابھی اُن کی رسائی نہیں ہوئی۔ اِس لئے وہ اپنے گردوپیش میں ہی گم رہتے ہیں۔

اِن تاریخ نویسوں کی تحریروں میں ہمیں خطابت کے اعلیٰ نمونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جیسا کہ پیری کلیس (Pericles) کی تقریر جو اُس زمانے کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ جس میں خود لکھنے والا بھی موجود تھا۔ ہم اِن تاریخ والوں کے ساتھ اُس دور کو سمجھ سکتے ہیں اور اُس دور کی روح کو پہچان سکتے ہیں۔ یہاں ہیگل، ہیروڈوٹس، تھوکوڈائیڈیز، زینوفون (Xenophone) اور سیزر (Ceaser) کی مثالیں دیتا ہے۔ اُس کے مطابق یہ تحریریں ابتدائی تاریخ کے منہاج کے ضمن میں آتی ہیں اور اُس کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فرانسیسی یادداشتوں (Memoires) کو بھی اِسی حوالے سے یاد کرتا ہے اور ایک معتبر نام کارڈنیل ریٹز (Cardinal Retz) کا ذکر کرتا ہے۔

بَری نے سب سے پہلے ہیکاٹیوس کا ذکر کیا تھا۔ لیکن ہیگل کے ہاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اور وہ ابتدائی تاریخ کے منہاج میں اِس کا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن ہیکاٹیوس اور ہیروڈوٹس کے درمیان بَری اساطیر نویسوں (Mythographers) فیری کائڈیس (Pherecydes) اور اکوسیلوس (Acqusilaus) کا ذکر کرتا ہے۔ جبکہ ہیگل گوئی کیارڈنی (Guicciardini) کا بھی ذکر کرتا

ہے۔ گوئی کیارڈنی (۱۴۸۳ء۔۱۵۴۰ء) اطالوی تاریخ نویس اور سیاست دان تھا۔ اُس نے اسپین میں فلورنس کے سفیر کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔ اُس نے ۱۵۴۰ء میں *History of Itlay* لکھی تھی جونشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کا اہم باب سمجھی جاتی ہے۔ بَری نے نظریہ گردش کو بیان کرتے ہوئے اُس کا ذکر کیا ہے۔[۵]

جب کبھی ہیروڈوٹس اور تھوکوڈائیڈیز کے موازنے کی بات ہوتی ہے تو تاریخ کے نقاد ہیروڈوٹس کو اُس کی عالمگیریت کی وجہ سے تھوکوڈائیڈیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے کولنگ ووڈ ہیروڈوٹس کے اسلوب کو زیادہ بلیغ اور آسان گردانتا ہے اُس کا یہ بھی اعتراض ہے کہ اُس کا تاریخ لکھنے کا ڈھنگ سائنسی انداز لئے ہوئے نہیں ہے۔ بلکہ وہ بقراط (Hippocrates) کے تتبع میں تعیناتی منہاج میں تاریخ لکھتا ہے۔ اور پھر وہ خود ہی سوال کرتا ہے کہ یہ نفسیاتی تاریخ کیا ہوتی ہے۔ یہ تاریخ ہرگز نہیں ہے بلکہ اثباتی علوم کی طرح کی کوئی چیز ہے۔[۶]

ول ڈورانٹ اِن دو تاریخ نویسوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہیروڈوٹس کی تاریخ نویسی میں جواں سالی کی کشش اور قوت ہے۔ جبکہ پچاس سال بعد تھوکوڈائیڈیز میں یہ پختہ ہو چکی تھی۔ اور اُس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ بعد میں آنے والے کئی ادوار تک اُسے وہ پختگی حاصل نہ ہوسکی۔ ہیروڈوٹس کی تحریر زیادہ آسان پر لطف اور نرم خو ہے۔ دوسرے یہ کہ تھوکوڈائیڈیز کی تاریخ کا دائرہ کار چھوٹا ہے۔ جبکہ ہیروڈوٹس عالمگیریت کی طرف مائل ہے۔[۷]

میں سمجھتا ہوں کہ ہیروڈوٹس بہت سی خوبیوں کے ساتھ کچھ تعصّبانہ نقطہ نظر بھی رکھتا ہے۔ اُس نے جو کچھ حبشہ کے مردوں کے مادہ تولید کے بارے میں کہا کہ وہ سیاہ ہے، سوائے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ سٹرابو نے بھی اِس طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ہیروڈوٹس کی تحریر بہت زیادہ بکواس ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ارسطو کی طرح ایک بڑے دائرہ کار میں کام کرتا ہے۔[۸]

جو لوگ تھوکوڈائیڈیز پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تاریخ نویسی کے ارتقاء کے ساتھ بہت سی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ حقائق کی من وعن تصویر کشی تو کبھی بھی نہیں ہوتی۔ ہر تاریخ نویس کا ایک موضوعی پہلو ہوتا ہے۔ جو متن میں گُندھا ہوتا ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کہیں زیادہ ہوتا ہے اور کہیں کم۔ مثلاً پیری کلیز (Pericles) کے آخری خطاب کے بارے میں جو اعتراض ہوئے ہیں اُس کے باوجود تھوکوڈائیڈیز کی وہ جسارت اپنا رنگ

جما گئی اور آج تک اُس کا بول بالا ہے۔ گو پیری کلیز کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فنِ خطابت کی طرف مائل نہ تھا۔ بلکہ سادہ زبانی میں بات کیا کرتا تھا۔ اُس پر ستم یہ کہ پلوٹارک نے یہ کہہ کر سارا رومان ہی ختم کر دیا کہ پیری کلیز کی کوئی تحریر باقی نہ بچی تھی اور اُس نے جو کچھ بھی کہا وہ بھی کہیں دستیاب نہیں ہے۔[9] اگر ہم اِن اعتراضات پر جائیں تو بعد میں تاریخ نویسی میں جو ترقی ہوئی اور خصوصاً فلسفۂ تاریخ کے حوالے سے جو نئے افق کھلے اُن کے لئے تو پھر کوئی جگہ نہیں رہتی۔ کیونکہ فلسفۂ تاریخ میں کسی ایک مفروضے کو بنیاد بنا کر ساری تاریخ کو اُس پر منڈھ دیا جاتا ہے۔

ہیگل کی انعکاسی یا تخیلاتی تاریخ (Reflective History)

دوسرے منہاج کو ہیگل انعکاسی منہاج قرار دیتا ہے۔ یہ تاریخ کا وہ منہاج یا قسم ہے۔ جہاں زمان ومکان کی بندش نہیں ہوتی اور اُس پر یہ شرط بھی عائد نہیں ہوتی کہ وہ ہم عصر واقعات پر مبنی تاریخ ہو۔ بلکہ اِس منہاج کی روح حال سے ماورا ہوتی ہے۔ وہ یہاں اِس کے حوالے سے اِس کی کئی اقسام گنواتا ہے۔ پہلی قسم کو وہ تاریخِ عالم (Universal History) کا نام دیتا ہے۔ اِس میں تاریخ نویس کا مقصد کسی ملک وقوم یا دنیا کی کلی تاریخ کا احاطہ کرنا ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں اصل مسئلہ مصنف کا تاریخی مواد سے معاملہ بندی کا ہے۔ یعنی وہ اُس مواد کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے۔ یہاں لکھنے والا اپنے ذہنی رجحانات اور افتاد کے حوالے سے اُن واقعات اور عناصر کو ترتیب دیتا ہے جو اُس سے الگ دوسرے زمانوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور وہ پہلے منہاج کی طرح اِن میں رنگا نہیں ہوتا۔ یہاں توجہ اِس بات کی طرف مرکوز رکھی جاتی ہے کہ اُن اصولوں کی پاسداری کی جائے جو واقعات اور کارناموں کو بیان کرتے وقت مصنف بروئے کار لاتا ہے۔ لیکن یہاں حقیقت یہ ہے کہ ہر لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس کا منہاج ہی اول وآخر ہے۔

پھر ہیگل کہتا ہے کہ جرمن اقوام میں بھانت بھانت کے تاریخ نویس اپنے اپنے منہاج کا علم بلند کئے ہوئے ہیں اور اپنے تئیں خود کو یکتا اور منفرد شمار کرتے ہیں کہ اِس ضمن میں فرانسیسی اور برطانوی تاریخ نویسوں کی صف بندیاں موجود ہیں اِس حوالے سے لیوی (Livy) کی مثال دیتا ہے۔ ٹائٹس لیوئیس (Titus Livius) (۵۹ قبل مسیح۔ ۱۷ عیسوی) یہ رومی تاریخ دان تھا۔ اُس نے کئی جلدوں میں *History of Rome* لکھی تھی لیکن ۱۳۵ جلدوں میں سے صرف ۳۲

دستیاب ہیں۔ وہ وطن سے محبت کرنے والا اور نکھرے ہوئے اسلوب کا تاریخ نویس تھا۔ لیوی رومی بادشاہوں اور سورماؤں کے منہ سے اِس انداز سے باتیں کہلواتا تھا جو اُس کے اپنے زمانے میں مستعمل تھا۔ اِس لئے جہاں تاریخ کے طویل دور کو قلم بند کرنا مقصود ہو۔ وہاں اکیلے واقعہ کی تفصیل دینا ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ وہاں کلی اور تجریدی سطح پر کسی دور کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اُس دور کے افکار کا ذکر بھی اِس ضمن میں آتا ہے۔ جو کسی دور کا سب سے مضبوط حوالہ ہوتا ہے۔

انعکاسی تاریخ کی دوسری قسم کو ہیگل نتائجی (programmatic) کہتا ہے جس کی وضاحت وہ یوں کرتا ہے کہ جب ہم ماضی کی بات کرتے ہوئے دور کہیں مگن ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن پر حال وارد ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا اُس کی فعالیت کا صلہ ہوتا ہے۔ تاریخ میں واقعات تو بے شمار بکھرے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ربط جو اِن کی گہرائی میں سرایت کر جاتا ہے وہ فقط ایک ہوتا ہے اور اِس طرح یہ عمل اُن واقعات کو ماضی سے نکال کر معناً حال میں لے آتا ہے۔ اِس طرح ہیگل کے نزدیک یہ تاریخ نویس ماضی کو حال سے جوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکمرانوں، سیاست دانوں، مدبروں اور اقوام کے حوالے سے اکثر یہ بات کی جاتی ہے کہ اُنہیں ماضی کے تجربات سے سبق سیکھنا چاہئے لیکن دوسری طرف تجربے اور تاریخ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ عوام اور حکومتوں نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا اور نہ ہی اُن سے جو اصول وضع ہوتے ہیں اُن پر وہ کبھی کاربند ہوئے ہیں۔ ہر دور اپنے اندر ایسی تخصیص لئے ہوتا ہے کہ صرف اُسی کے حوالے سے اُسے پرکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے کسی اہم موڑ پر ہیگل کے نزدیک حالات کے دباؤ کے تحت عام اصول کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ اِس قسم کے حالات میں ماضی سے ایسی مثالیں تلاش کرنا بے سود ہوتا ہے۔ اِس حوالے سے اِس سے گھٹیا کوئی اور مثال نہیں ہے کہ ہم انقلاب فرانس کی مماثلتیں تاریخِ یونان اور روم میں تلاش کرنا شروع کر دیں۔

اِس ضمن میں وہ تیسری قسم تنقیدی (Critical) بتلاتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک اُس کے زمانے میں جرمن اقوام اِس قسم کی تاریخ لکھنے میں مبتلا تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے اُن کا تاریخ سے تو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ تاریخ کی تاریخ ہوتی ہے۔ یہاں تاریخ نویس، تاریخی واقعات پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور اُن کی سچائی اور ثقالت کو زیر بحث لاتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ

کچھ ایسی باتیں بھی سامنے لاتا ہے۔ جو تاریخ میں کہیں رقم نہیں ہوتیں۔ فرانسیسی ایسی تاریخ لکھنے کے ماہر ہیں۔ جرمنوں کے ہاں تاریخ نویسوں نے علم اللسان کی مروجہ تنقید کو اپنا منہاج بنالیا ہے اِس طرح یہ اعلیٰ تنقید جو کہ کھوکھلے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ ہر قسم کی ہیبت ناکیوں کو اپنے اندر سمو رہی ہے۔ اِس میں موضوعی تخیلاتی مواد زیادہ ہوتا ہے۔

انعکاسی تاریخ کی آخری قسم کے جزوی ہونے کا اعتراف خود اُس کے منہاج میں موجود ہے۔ لیکن تاریخ یہاں فن، قانون اور مذہب کو تجریدی سطح پر زیرِ بحث لاتی ہے۔ اِس لئے یہ فلسفیانہ تاریخ کی طرف ایک قدم ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ آج اِس قسم کی تاریخ کے خیالات بہت زوروں پر ہیں۔ یہاں کسی بھی جزو کو سچائی کے کل کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ اور یہاں تاریخی واقعات کی صف بندی ایک اجتماعی قومی حوالے سے کی جاتی ہے۔ جہاں بیرونی اور اندرونی عوامل کی کارفرمائی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور یہی وہ خاص موڑ ہے جو اُسے فلسفیانہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ فلسفۂ تاریخ کا آغاز ہیگل سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اِس اصطلاح کو والٹیئر نے متعارف کروایا تھا۔ بعدازاں جرمن مفکروں نے اِس کی آبیاری کی۔ جن میں ھرڈر (Herder)، کانٹ (Kant)، شلر (Schiller)، فشٹے (Fichte)، شیلنگ (Schelling) کے نام قابل ذکر ہے۔ ہیگل کے بعد کارل مارکس اور اینگلز کے تاریخی مادیت کے حوالے سے تاریخ کو دیکھنے کے نئے افق کھولے۔ ہیگل سے پہلے بھی وکو یا ویچو (Vico) نے اُس کو استحکام بخشا۔

ہرڈر نے اِس کائنات کے ارتقا اور نشوونما میں سے زمین، معدنیات، نباتات اور حیوانات کو ترقی کی طرف جاتے انسان کی منزل پر پایا۔ وہ اِس میں مقصدیت کو ڈھونڈتا ہے کہ نشوونما اور ترقی کا ہر مرحلہ جو فطرت سے پیدا ہوتا ہے۔ آگے کی طرف جاتا ہے۔ اِس طرح انسان فطرت کے مادی پہلو اور روحانی پہلو کے مابین ایک ربط کا کام دیتا ہے۔ اور ابھی اُس کا یہ سفر جاری وساری ہے لیکن اِس روحانی دنیا کو انسان نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ یہ ازل سے موجود ہے اور انسان زمین پر آ کر اِس روحانی دنیا کے ذریعے خود کو realize کر رہا ہے۔ اور اِس طرح تہذیبوں اور انسانوں میں بھی تمیز کر رہا ہے۔ اُس کے نزدیک مختلف نسلوں اور تہذیبوں میں جو ایک دائمی فرق

ہے۔اور انسانوں میں بھی مختلف تاریخی نامیے (Historical organisms) ہیں جن میں سب سے برتر یورپی نامیہ ہے۔ یورپ اکیلا ایسا خطہ ہے جہاں انسانی زندگی حقیقی طور پر تاریخی ہے۔ باقی خطوں میں تاریخی نشوونما نہیں ہے۔ اُن میں ہندوستان بھی شامل ہے ہیگل نے اِسی سے یہ بات لیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ جس پر بعدازاں مارکس نے اِس بات کو دوہرایا۔ کانٹ بھی اِس بات کا داعی ہے کہ فطرت ایک منصوبہ بندی کے تحت چل رہی ہے۔ اور اِسی طرح اگر انسان کی زندگی بھی آگے بڑھ رہی ہے تو یہ بھی کسی منصوبے کے تحت ہے اور وہ انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے فطرت کی کسی بڑی منصوبہ بندی کو بغیر سوچے سمجھے انسان اور بنی نوع انسان اُس پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ لیکن اِس منصوبہ بندی کا واضح تصور اُس کے ہاں موجود نہیں ہے۔ یہ ہیگل کی عقل یا حقیقت مطلقہ کی منصوبہ بندی سے مماثلت رکھتا ہے جس کی طرف تاریخ ہمیں لئے جا رہی ہے۔ جیسا کہ تاریخ ساز شخصیتوں کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی ہے کہ وہ کس محرک کے تحت کام کر رہی ہیں۔ اِس طرح کانٹ تاریخ کی منصوبہ بندی اور فطرت کی منصوبہ بندی کے مابین یکساں پہلو ڈھونڈھ رہا ہے۔

کولنگ ووڈ یہ سمجھتا ہے کہ کانٹ کے نزدیک تاریخ میں فطرت کی منصوبہ بندی دراصل انسانی اختیار یا آزادی کی نشوونما ہے۔ یہاں عقل اور اختیار کا جو نظریہ کانٹ فطرت سے لیتا ہے۔ میرے خیال میں ہیگل نے اُس سے جو بہت کچھ اخذ کیا ہے۔

لیکن اگر ہم ماضی میں جائیں تو سینٹ آگسٹین اور بوسے (Bossuet) (۱۷۰۴ء۔۱۶۲۷ء) بھی ہیگل پر اثر انداز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں بوسے کے ہاں مشیت ایزدی اور ہیگل کے ہاں عقل (Reason) دونوں کے کردار یکساں ہیں۔ اِن کے ہاں اور تعقلات کی بھی بہت مماثلت ہے۔ جہاں تاریخ ساز شخصیتیں یہ نہیں جانتیں کہ تاریخ کی کون سی قوت اُنہیں کھینچ کر کہاں لئے جا رہی ہے۔ اپنے تئیں وہ اپنی خودغرضی اور ولولہ انگیزی کے تحت آگے بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ لیکن بوسے کے ہاں مشیت ایزدی (Divine Providence) اور ہیگل کے ہاں عیاری عقل (Cunning of Reason) اُن سے یہ کام کروا رہی ہوتی ہے۔ بوسے کہتا ہے کہ بالآخر نہ صرف مقدس تاریخ بلکہ سلطنتوں کے عروج وزوال کو بھی صرف اُس سری نظام کے تحت سمجھا جا سکتا ہے جو اُس کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ اُس کے نزدیک صرف خدا ہی یہ جانتا ہے کہ ہر شے کو

کس طرح اُس کے منشا کے مطابق طے پاتا ہے۔ اگر ہم تخصیصی علتوں کو ذہن میں رکھیں تو ہر چیز اور وقوعہ حیران کن ہے۔ لیکن واقعات ایک نظام کے تحت آگے بڑھ رہے ہیں۔[1]

تاریخ نویسی کی یہی نشو ونما ہمیں ہیگل کے فلسفہ تاریخ تک لے جاتی ہے۔

فلسفیانہ تاریخ

ہیگل کا تیسرا منہاج فلسفیانہ تاریخ کا ہے۔ ہیگل کا یہ تاریخ کو دیکھنے کا اپنا انداز ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست نہیں ہے کہ ہیگل سے پہلے کسی نے یہ انداز اپنایا ہی نہیں تھا۔ گو اتنے جامع انداز سے نہیں لیکن پھر بھی ہیگل سے پہلے کئی ایک مفکروں نے تاریخ نویسی کی اِس روش کو اپنایا تھا۔ اِن کا جائزہ ہم ہیگل پر تنقید کے پیرے میں لیں گے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں کہ ہیگل خود کیا کہتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک انسان کو جانوروں سے جو چیز ممیز کرتی ہے وہ فکر ہے اور فکری تعقل عقل کے ذریعے تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔ وہ کہتا ہے عقل کی اِس دنیا پر حکمرانی ہے اور تاریخ عالم ہمارے سامنے عقل کی کارفرمائی کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ عقل محرک توانائی ہے اور وہ اِس کے لئے کسی خارجی عنصر کی محتاج نہیں اور اِس طرح اپنے افعال کی غایت بھی خود ہے۔ اُن کے حصول کے لئے وہ محرک توانائی بھی ہے۔ جو نہ صرف مادی وقوعات بلکہ تمام عالم روحانی یعنی تاریخِ عالم کی نمود میں بھی کارفرما ہے۔ اِس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عقل کا ہی پرتو ہے یعنی عقل یہاں خود کو آشکار کر رہی ہے اور اِس کے سوا آشکار کرنے کے لئے ہے بھی کیا۔ اِس کا یہ ظہور ایک جاہ وجلال لئے ہوئے ہے۔ عقل کا حتمی فیصلہ یہ ہے کہ تاریخ کے تار و پود کی نشو ونما روحِ عالم کی طرف لازمی عقل کے سفر کی مرہون منت ہے۔

ہیگل اِس بات کو فلسفی انکساغورث (Anaxagoras) کی مثال سے سمجھاتا ہے اور عقل کے دائرہ عمل کے اطلاقی پہلو کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انکساغورث کی طرح یہ سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہے کہ عقل کی دنیا پر حکمرانی ہے۔ بلکہ اِس اصول کو وضع کرتے ہوئے اُسے دوسرے روابط اور وقوعات سے جوڑنا ہی اصل بات ہے یعنی اُس کا اطلاق اور مادی نمو بالکل دوسری بات ہے۔ سقراط نے بھی انکساغورث کی اِس کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اگر مذہبی صداقتوں کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں علت و

معلول کا رشتہ حادثاتی یا اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ یہ مشیت ایزدی کے تابع ہے جو خود بے پناہ قوت سے معمور حکمت ہے۔ جسے خود اپنے مقصد کی تکمیل کا احساس ہے۔ پھر ہیگل ایک دوسری بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض لوگ اپنی زندگی میں کسی بڑی تبدیلی کو مشیت ایزدی کے تابع سمجھ لیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے پھر وہ انکساغورث والی غلطی دہراتے ہیں۔ کیونکہ اِس معاملے میں اُن کا اعتقاد صرف عام یقین یا ایمان کے مترادف ہے۔ یہ صرف بس ایمان ہے اور یہ اطلاق میں تبدیل ہوتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی یہ اُنہیں تاریخِ عالم میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اِس طرح مشیتِ ایزدی پر اعتقاد کا یہ نظریہ ہمیں مطمئن نہیں کرسکتا۔ جب تک اعتقاد کو اُن سارے حالات پر لاگو نہ کیا جائے جس سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے اور یہ دیکھیں کہ اُس کی عمل پذیری کے کیا ذرائع ہیں اور وہ تاریخی واقعات کیا ہیں۔ جن میں وہ خود کو آشکار کرتی ہے۔ کیونکہ ہمیں اُس کے حوالے سے واقعات میں ربط کو تلاش بھی کرنا ہے۔

روح، تاریخ اور اختیار

جرمن زبان میں Giest کا لفظ ذہن اور روح دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اِس لئے ہمیں ہیگل کے فلسفہ میں جب بھی اِس اصطلاح سے واسطہ پڑے گا۔ تو ہم اُسے جدید حوالے سے ذہن کے طور پر لیں تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

ہیگل کہتا ہے کہ تاریخِ عالم کا تعلق اقلیم روح سے ہے اور تاریخِ عالم میں روح یا ذہن اپنی سب سے پائیدار حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اُس کے نزدیک یہاں اِس کے مختلف موضوعات سامنے آتے ہیں۔ یعنی خصلتِ روح کی مختلف حالتیں کیا ہیں۔ روح کے تصور کے حصول کے کیا ذرائع ہیں اور ریاست بطورِ تجسیم روح کا تعقل کیا ہے۔

ہیگل کے نزدیک جیسے مادے کا جوہر ثقالت (Gravity) ہے اُس طرح روح کا جوہر اختیار یا آزادی (Freedom) ہے اور آزادی ہی روح کی صداقت واحدہ ہے۔ مادے کے برعکس روح کا مرکز اُس کی ذات میں ہے یعنی روح 'مشتمل بالوجود' ہے اور یہی حقیقی اختیار ہے۔ یہ مشتمل بالوجود روح دراصل اپنی ہستی کی آگہی کا دوسرا نام ہے۔ آگہی میں دو چیزوں میں تفریق لازم ہے یعنی میں جانتا ہوں اور دوسرے میں کیا جانتا ہوں۔ خود آگہی اپنے اندر دونوں کو سموئے

ہوئے۔ کیونکہ روح خود سے آگاہ ہے۔ ایک عمومی تعریف کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخِ عالم روح کا وہ اظہار ہے۔ جہاں وہ اپنی امکانی قوت کی جانکاری کے عمل میں مصروف ہوتی ہے۔ جیسے ایک بیج کی امکانی قوت میں ایک درخت کے طور پر پھیلنے کی تمام خصلت موجود ہوتی ہے۔

اب اِس اختیار یا آزادی کے تعقل کو ہیگل تاریخ کے حوالے سے مختلف اقوام پر لاگو کرتے ہوئے تاریخ میں اُن کے مقام کو متعین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُس کے نزدیک مشرقی اقوام اِس سے آگاہ نہیں تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انسان بطورِ انسان بااختیار ہے۔ وہ اپنے حکمرانوں کو اِس انداز میں دیکھتی تھیں کہ وہ بااختیار ہیں۔ لیکن ان کا اختیار صرف متلون مزاجی، خونخواری اور جوش و جذبات کے والہانہ پن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اِس طرح وہ شخص صرف استبداد کار (Despot) ہے بااختیار نہیں ہے۔ پھر وہ یونانیوں کے اختیار یا آزادی کی بات کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ وہ بااختیار تھے۔ لیکن اُن کی یہ آزادی شہریوں تک محدود تھی۔ غلام بااختیار اور آزاد نہیں تھے۔ پھر جرمن قوم کو مکمل طور پر بااختیار کہتا ہے کہ جہاں ایک فرد نے فرد کے طور پر خود کو بااختیار پایا۔ اِسے وہ عیسائیت اور فرد کے آزادی کی طرف سفر کی دین کہتا ہے۔

ہیگل یہ کہتا ہے اختیار کی نمود کے ذرائع یا عوامل جو تاریخ میں ظاہر ہوتے ہیں عمومی طور پر خارجی ہیں اور حیاتی دنیا میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بہت سے انسانی اعمال و شخصی ضرورتیں، جذبوں، کرداری رجحانات اور ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے تحریک پذیر ہوتے ہیں۔ اُس کے برعکس دوسری طرف فیاضی، بنی نوع انسان کی خدمت یا دوسروں کی بھلائی چند ایسے کام جو ذاتی غرض سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن انسانی نسل کی تاریخ میں اُن کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِس لئے تاریخ میں اُن کا کردار بھی اہم نہیں ہے۔

دوسری طرف ولولہ انگیزی، ذاتی مقاصد کی تسکین انسانی اعمال کے بڑے محرکات ہیں۔ اُن کی بجا آوری کے وقت اصول، اخلاقی اقدار اور سماجی بندھن اُن کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ انہی خواہشات کے زیرِ اثر تاریخ میں المناک اور اندوہناک واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔ بظاہر اِن کے پیچھے انسانی جذبہ اور خواہش کارفرما ہے۔ لیکن جب ہم اِس پر غور کریں اور یہ کہیں کہ تاریخ وہ تختۂ دار ہے جس پر لوگوں کی خوشیوں، ریاستوں کی حکمت اور افراد کی نیکیوں کو قربان کر دیا گیا تو بھی یہ سوال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر کس اصول اور کس حتمی مقصد کے لئے ایسا کیا گیا۔

ولولہ اور ولولہ انگیزی (Passion)

انسان کی احتیاج، جبلت، طبع اور ولولہ انگیزی کی وہ قوتِ محرکہ ہے جو اُنہیں روبہ عمل کرتی ہے اور ایک معینہ وجود سے نوازتی ہے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا کوئی تو تعقل یا عمل صورت پذیر ہو۔ وہ اُس کے لئے ساری شخصیت اُس میں جھونک دیتا ہے۔ کیونکہ اُس کا مطمئن ہونا اُس کے حصول سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان کسی مقصد کے لئے پوری طرح سرگرم ہو جاتا ہے تو وہ اُس کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ اِس طرح اُن کاموں کی تکمیل یا حصول اُس کی تسلی کا باعث بنتا ہے۔

بعض اوقات ایسے لوگوں پر الزام تراشی کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ذات اور مفاد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہماری نظر میں اُس وقت وہ بڑی منصوبہ بندی نہیں ہوتی جس کی آڑ میں وہ ذاتی مفاد کو پروان چڑھا رہے ہوتے ہیں۔ ہیگل بار بار اِس بات کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے کہ کرداروں کے ذاتی مفادات کے بغیر کچھ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ اگر ہم اِس مفاد کو جذبہ یا ولولہ کہیں تو باقی کاموں کو چھوڑ کر اِس مفاد کے تحت ایک فرد تمام ممکنہ قوت اور ارادے کے ساتھ ایک مقصد کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِس دنیا کی معرکتہ الآرائی بغیر جذبے کے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ جذبے اور ولولے سے ہیگل کی مراد وہ انسانی سرگرمی ہے جو ذاتی مفادات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور انسان پوری شد و مد کے ساتھ اُس کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے اور باقی کام اُس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں اور اُس کی راہ میں قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ ہیگل کے نزدیک Passion کردار کا ایک خاص میلان ہے۔ یہ میلان نہ صرف ذاتی مفادات کا تحفظ کرتا ہے بلکہ من حیث المجموع گروہی اہداف کے حصول کے لئے بھی سرگرم رہتا ہے۔ لیکن اِن کے بہت سے ذاتی مفادات اور ولولہ انگیزی کی آڑ میں تاریخِ عالم تصور روح یا عقل کے عام مقصد کے حصول کے لئے اپنا باب کھول رہی ہوتی ہے۔ اور یہ مقصد اِس کے اندر مخفی ہوتا ہے اور یہ اِس کی تعمیر میں مضمر ہے۔ ایک مخفی جبلت کے طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہے اور تاریخ کا تمام عمل اِس غیر شعوری اضطراب کو دامِ آگاہی میں لانے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارادی مفادات اور سرگرمیوں کا یہ اکٹھ ہی روح عالم کے مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں جو اِسے دامِ آگاہی میں لاتے ہیں۔

یہاں رُک کر یہ بات کرنا ضروری ہے کہ ولولہ (Passion) اور عقل روح یا ذہن (Giest) کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ گو ہیگل یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ کا منظر نامہ ولولہ انگیزی سے ترتیب پاتا ہے۔ لیکن اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے جیسا کہ کولنگ ووڈ بھی سمجھتا ہے کہ اِس میں عقل کی کارفرمائی نہیں ہے یا یہ سب کچھ عقل کے تحت نہیں ہو رہا۔ اُس کے نزدیک یہ سب عقل کے تابع ہے۔ وہ اِس لئے کہ عقل اِس ولولہ انگیزی کو اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔

تاریخی شخصیات

اِس صورتِ حال میں تاریخ میں مختلف اعمال کی جامعیت ایک دوسری تصویر سامنے لاتی ہے۔ تاریخ ایسے عظیم لمحات سے پُر ہے جہاں مروجہ نظام اور قوانین اِن امکانی یا اتفاقیہ رونما ہونے والے واقعات سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ جو کہ مروجہ نظام کی نفی کر رہے ہوتے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مروجہ نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بالآخر تاریخ کے لئے یہی ناگزیر اور لازمی ہوتا ہے اور وسیع معنوں میں اُس وقت سودمند بھی ہوتا ہے۔ یہ امکانات تاریخ میں حصول کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور اُن میں جو اصول کارفرما ہوتے ہیں وہ اُن سے قطعی مختلف ہوتے ہیں جن پر ریاست اور عوام کے استحکام کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ اصول تخلیقی تصور کی نمو میں ایک لازمی مرحلہ ہے یہ اُس صداقت کا حصہ ہے جو خود اپنے حصول کی طرف گامزن ہے۔ تاریخ ساز شخصیات یا عالمی تاریخی افراد صرف وہ ہیں۔ جن کے مقاصد میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے۔

اِس سلسلے میں ہیگل جولیس سیزر، سکندر اعظم اور نپولین کی مثالیں دیتا ہے۔ اُس کے مطابق تمام تاریخی شخصیات کے مخصوص ذاتی مقاصد دراصل اُن بڑے تقاضوں کا حصہ ہوتے ہیں جو تاریخِ عالم کے ارادے کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسے افراد تاریخ میں ہیرو کہلاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی قوت محرکہ اُن کے اندر سے پھوٹتی ہے ایسے افراد جس عام تصور کو منظرِ عام پر لا رہے ہوتے ہیں وہ اُن کے احاطہء شعور میں نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ہم اِن کی تاریخ پر ایک نظر دوڑائیں جن کی قسمت میں تاریخ کا کارندہ ہونا لکھا ہے تو یہ جان پائیں گے کہ خوشی اُن کے نصیب میں نہ تھی اُنہیں مسرت کے پُرسکون لمحات میسر نہ آ سکے۔ اُن کی تمام زندگی جدوجہد، ان تھک محنت

اور صعوبتوں سے عبارت تھی اُن کی زندگی میں ولولہ انگیزی کے سوا کچھ بھی نہ تھا ایسے افراد جب اپنے مقصد کو پالیتے ہیں تو ایسے گر پڑتے ہیں جیسے دانے سے چھلکا اُتر کر گر پڑتا ہے اور وہ پھر جلد مر جاتے ہیں جیسے سکندر اعظم یا قتل کر دیئے جاتے ہیں جیسے سیزر یا پھر نپولین کی طرح سینٹ ہلینا میں جلاوطن کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ ہیرو صرف اپنے مقصدِ واحد کی تکمیل میں جٹے ہوتے ہیں اُن کی راہ میں باقی ہر شے ہیچ ہوتی ہے۔ اِس صورتِ حال میں عام مجوزہ نیک مقاصد یا قوانین اُن کی اپنی ولولہ انگیزی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ لیکن ایسی جلیل القدر ہستیوں کے پاؤں کے نیچے کئی معصوم پھول مَسلے جاتے ہیں۔ اُن کی راہ میں آنے والی ہر چیز پاش پاش ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں تاریخ کا عام تصور مخفی رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنا کام کر جاتا ہے اُسے ہیگل ریاکاری عقل (Cunning of Reason) کا نام دیتا ہے۔ ریاکاری عقل ولولہ انگیزی کو اپنے لئے استعمال کر جاتی ہے اور وہ جو اُس کی نمو کے لئے کام کرتا ہے سزا بھی اُسے ہی ملتی ہے اور نقصان بھی وہی اُٹھاتا ہے۔ اِس طرح ہیگل کے نزدیک بہت سے منفی واقعات جو شر کے ضمن میں آتے ہیں اصل میں عقل کی نمو کا حصہ ہوتے ہیں اور تاریخ کی نشوونما میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ افراد اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے دراصل تاریخ عالم یا عقل کی کارفرمائی کا حصہ بنتے ہیں۔

ہیگل کے فلسفہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم یہ موازنہ کر سکتے ہیں کہ باقی مقصدی تاریخی نظریات (Teleological Theories) اور ہیگل کے نظریئے میں کیا فرق تھا کہ وہ فلسفہ تاریخ کے ضمن میں نہیں آتے۔ اِس سلسلے میں ہم خصوصاً مسیحی تاریخ نویسی یا یورپی لحاظ سے مذہبی تاریخ نویسی کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ جہاں ہیگل عقل کو تاریخ کا منظر نامہ کھولنے کا سبب بتاتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ عیاری عقل اصل مقصد کو انسانوں سے مخفی رکھتی ہے اُسی طرح سینٹ آگسٹین اور دوسرے مذہبی تاریخ نویس عیسائیت کے حوالے سے یہ بات کرتے ہیں کہ تاریخ کی نشوونما میں خدا کا مقصد کارفرما ہے اور ساری تاریخ اس مقصدیت کی طرف رواں دواں ہے، جو خدا نے متعین کیا ہے ہر شخص اپنے طور پر جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا اُس کے ایسا کرنے میں کیا راز ہے یا وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کیوں کر رہا ہے۔ اُن کے نزدیک وہ ایسا اِس لئے کر رہا ہے کہ خدا نے اُس کے لئے یہی چاہا ہے اور یہی راستہ مقرر کیا ہے۔[۱۲]

بعض اوقات سینٹ آگسٹین کے فلسفہ تاریخ اور مشیت ایزدی کو ہیگل کی عقل کی کارفرمائی کے ساتھ مماثلت دی جاتی ہے وہ یوں کہ اُن کا انجام ایک ہی ہے یعنی یہ سب تصور مطلق اور خدا کی طرف سے متعین کردہ راہ کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن مشیت ایزدی والے نظریئے کے حوالے سے ہیگل انکساغورث والی مثال سے واضح کر چکا ہے۔ ہیگل کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں ہے۔ لیکن وہ عقل کی Unfolding کی مسلسل بات کرتا ہے جو دنیا کے واقعات میں کھل رہی ہے۔ لیکن وہ انسانوں کی اجتماعی عقل (Totality) کی بات کرتا ہے اُس کے لئے عقل ہی یہ قوت محرکہ ہے۔ بعض اوقات وہ اِسے جرمن ریاست کی شکل میں ایک تکمیل کی صورت میں دیکھتا ہے جسے 'انتہائے تاریخ' (End of History) بھی کہا جاتا ہے۔

لیکن ایک سوال جو مختلف نقادوں کے ایجنڈے پر موجود رہتا ہے وہ یہ کہ کیا ہیگل نے جو کچھ دیا وہ سب اُس کا اپنا تھا اور اِس سے پہلے یہ بات کسی نے نہیں کہی۔ تو جیسا کہ کولنگ ووڈ کہتا ہے کہ عالمی تاریخ کا نقطہ نظر اُس نے ہرڈر (Herder) سے لیا۔ اور پھر جو اختیار اور آزادی کی بات ہے اور سماجی سطح پر اخلاقی عقل کے طور پر سامنے آتی ہے اور اِس سوال کا جواب دیتی ہے کہ ریاست کیسے وجود میں آئی اُسے کانٹ کے قریب لے جاتی ہے اور اِسی طرح جو عقل کی خود آگاہی کا نظریہ ہے وہ فشٹے سے مستعار لیا ہوا ہے۔ یہ جو مشیت ایزدی کی بات ہے اُس پر سڈنی ہک یہ سمجھتا ہے گو ہیگل تصورِ مطلق کی بات کرتا ہے لیکن اُس کے نزدیک ہیگل کے حوالے سے تمام تاریخ خدا کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔[۱۳]

حوالہ جات

1. Collingwood, R.G., *The Idea of History* (Oxford: London: 1978), p.11.
2. Griffith, R.T.H., *The Hymns of the Rigveda* (Delhi: Motilal Banarsi Das, 1988), V.29, p.10.
3. Homer, Iliad, 1974, p.216.

4. Burri, J.B., *The Ancient Greek Historians* (New York: Dover Publication Inc., 1958), p.2.
5. Hegel, G.W.F., Translated by Sibree, *The Philosophy of History* (New York: Prometheus, 1991), p.4.
6. Collingwood, *op.cit.*, pp.28-29.
7. Durant, Will, *The Story*, Part-II: *The Life of Greece* (New York: Simon and Schuster, 1966), pp.430-433.
8. Strabo, *Geography* (London: G. Bell & Sons, 1912), XVII.I.52.
9. Mahaffy, J.P., *Social Life in Greece* (London: 1925), p.208.
10. Bossuet, Translation of *Discourse*, p.404.
11. Collingwood, *op.cit.*, p.116.
12. *Ibid.*, p.48.
13. Hook, Sidney, *From Hegal to Marx* (Michigan: Ann Arbor, 1971), p.36.

سائنس کی تاریخ نویسی

ڈاکٹر انیس عالم

رجحانات

سائنس کی تاریخ نویسی میں دو بڑے رجحانات ہیں۔

اول: داخلیت(Internalism)

دوم: خارجیت(Externalism)

خارجیت جس میں سائنس کی ترقی کو زمانے کے معاشی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے، کی بھی کئی ذیلی شاخیں ہیں جن میں سائنس کی سماجیات، نوآبادیاتی سائنس، سائنس کے بارے میں نسوانی نکتہ نظر، جبکہ داخلیت میں سائنس کی تاریخ کو محض سائنسی نظریات کی ترقی تک محدود درکھا جاتا ہے۔ نصابی کتابوں میں اکثر داخلیت کا نکتہ نظر ہی اپنایا جاتا ہے۔

برصغیر میں سائنس کی تاریخ نویسی ترقی کر رہی ہے جبکہ پاکستان کے اکیڈمک حلقوں میں اس کا وجود ڈھونڈے سے بھی نہیں پایا جاتا۔

سائنس کی تاریخ نویسی

کئی سال پہلے میں نے پاکستان میں سائنس کی تاریخ پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ جس طرح تاریخ نویسی میں بہت سے رجحانات سامنے آئے ہیں اسی طرح سائنس کی تاریخ نویسی میں بھی کئی نئی جہتوں کو متعارف کروایا گیا ہے۔ ابتدا میں سائنس کی تاریخ بھی سائنسی نظریات، سائنس دانوں اور ان کے کارناموں کی تاریخ ہوتی تھی۔ اس کی ایک اولین مثال برطانوی مصنف ولیم وہیول(William Whewell) کی کتاب 'استقرائی سائنس کی تاریخ'

(History of Inductive Sciences) ہے جو اس نے ۱۸۳۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں سائنس کا ایک مخصوص تصور اختیار کیا گیا تھا جس کے مطابق وہی علوم سائنس کہلائے جو تجربی طریقہ کار سے حاصل کی ہوئی معلومات سے بذریعہ استقرائی عمل وضع کیے گئے ہوں۔ مزید برآں مصنف کے مطابق سائنس کی ترقی خود اپنی خلقی تحریک کی وجہ سے خطی انداز میں ہوتی ہے مثلاً گیلیلیو (Galileo) کے قوانین حرکت کی دریافت کے بعد میں نیوٹن کے قوانین کی دریافت ممکن ہوئی اور نیوٹن کے بعد ہی آئن سٹائن کی دریافتیں ممکن ہوسکیں۔ سائنس کی دریافتوں اور ان کی ترقی کو سیاق وسباق سے جدا کر کے دیکھا گیا تھا۔ اس طرح سائنس دانوں کی تخلیق کو ان کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر سے آزاد تصور کیا گیا تھا۔ مزید برآں وہیول نے غیر یورپی ممالک میں تخلیق پانے والی سائنس کو بھی اس قابل نہ سمجھا کہ اسے تاریخ سائنس کا حصہ بنایا جائے۔ وہیول کی کتاب میں اس طرح ایک یورپی (Eurocentric) نکتہ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ یہ انداز نظر داخلی (Inernalist) کہلایا۔

وہیول کی کتاب کو سامنے رکھتے ہوئے لیکن اس کا انداز فکر اپناتے ہوئے ہندوستانی مؤرخ بی این سیل (B.N. Seal) نے ۱۹۱۵ء میں اپنی کتاب *The Positive Science of Ancient Hindus* شائع کی۔ تقریباً اس دور میں پہلی عالمی جنگ کے دوران بلجیم سے امریکہ میں منتقل ہوئے تاریخ دان جارج سارٹن نے وہیول کی کتاب کے برخلاف ایک ضخیم تاریخ عالمی سائنس پر کام شروع کیا۔ سارٹن پہلے ہارورڈ یونیورسٹی میں اور ۱۹۲۰ء کے بعد سے واشنگٹن کے کارنیگی انسٹی ٹیوشن کے شعبہ تاریخ سے منسلک رہا۔ اسے امریکہ میں 'تاریخ سائنس' کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تین جلدوں میں تاریخ سائنس تحریر کی جس میں سائنس کو ایک مشترک انسانی ورثہ سمجھتے ہوئے کرہ ارض کے مختلف علاقوں میں تخلیق کی ہوئی سائنس کا احاطہ کیا گیا۔ سارٹن نے تاریخ سائنس کو مختلف عہدوں میں تقسیم کیا۔ ہر عہد پچاس سالوں پر محیط ہے۔ ہر عہد کے ساتھ وہ ایک مرکزی کردار کو نتھی کرتا ہے۔ اس طرح ۵۰۰۔۴۵۰ قبل مسیح افلاطون (Plato) کا دور ہے جس کے بعد ارسطو (Aristotle)، اقلیدس (Euclid) اور ارشمیدس (Archimedes) کے ادوار یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ ۷۵۰ سے ۱۱۵۰ر بعد از مسیح کا زمانہ بالترتیب جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، مسعودی، البیرونی اور عمر خیام کے ادوار پر محیط ہے۔ ساڑھے تین سو سال کے اس

عرصے میں عالم اسلام کے عرب، ترک، افغان اور فارس نژاد کیمیادان، الجبرادان، طبیب، جغرافیہ دان، ریاضی دان، طبیعیات دان اور فلکیات دان سائنس کی عالمی سطح پر چھائے ہوئے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی سے پہلے مغربی نام سامنے آنے لگتے ہیں لیکن پھر بھی ڈھائی سو سال تک عالم اسلام کے مفکر ابن رشد، نصیرالدین طوسی اور ابن نفیس اپنے اعلیٰ مقام کے ساتھ ممتاز رہتے ہیں لیکن پندرھویں صدی کے بعد مغرب کے سائنس دان عالم سائنس پر مکمل غلبہ حاصل کر لیتے ہیں حتیٰ کہ اب اسکول کالجوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں میں جگہ پانے والے سائنس دانوں میں غیر مغربی ممالک کے سائنس دانوں کا ذکر نایاب ہے۔ سارٹن کی تاریخ سائنس اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کرتی اور نہ ہی سائنسی تخلیقات کا سیاسی، معاشی، ثقافتی و مذہبی پس منظر سارٹن کی کتاب کا موضوع ہیں۔ سارٹن سائنس کی تاریخ کو سائنسی حقائق و نظریات کی تاریخ کے طور پر تحریر کرتا ہے۔

جارج سارٹن نے تاریخ سائنس کا ایک علمی جریدہ 'ISIS' اور ایک سالنامہ 'OSIRIS' کے نام سے جاری کیے، یہ دونوں جرائد ابھی تک باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں سائنس کی تاریخ نویسی میں ایک نئی جہت متعارف کروائی گئی۔ لندن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ کی دوسری بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار ایک بڑے روسی وفد نے شرکت کی جس کی رہنمائی لینن کے قریبی ساتھی نکولائی بخارن نے کی اور جس میں مشہور جینیاتی ماہر (Geneticist) واوی لاو (Vavilou)، ریاضی دان کولیمن (Coleman) اور طبیعیات دان بورس ہیزن (Boris Hazen) بھی شامل تھے۔ بخارن نے سائنس کی تاریخ نویسی کا مارکسی نکتہ نظر پیش کیا۔ مارکس کے مطابق:

> مادی زندگی کی پیداوار کا طریقہ کار معاشرتی زندگی کے سماجی، سیاسی اور فکری عمل کا تعین (Condition) کرتا ہے۔

بخارن کے مطابق تاریخ نویسی کے روایتی نظریات لوگوں کی تاریخی سرگرمیوں کا منبع و ماخذ محض ان کے فکری محرکات میں ہی دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان محرکات کی اصل بنیاد کی شناخت نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً تاریخی واقعات کی توجیہہ محض انسانوں کی انفرادی فکری تحریک سے کی جاتی ہے۔ اس طرح تاریخ میں کسی قسم کے معروضی قوانین کی نشاندہی کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔ 'خیال دنیا پر حکومت کرتے ہیں'۔ تاریخ کا بہاؤ انفرادی قابلیت، لیاقت اور محرکات سے معین ہوتا

ہے 'شخصیت تاریخ کی خالق ہے۔' مارکسی نظریہ اس خیال کی بھی نفی کرتا ہے جس کے مطابق تاریخ کا موضوع عوام الناس نہیں بلکہ عبقری (Genius) کی شخصیات ہوتی ہیں۔ اس نکتہ نظر کا نمائندہ کارلائل ہے جس کے مطابق 'تاریخ عظیم لوگوں کی کہانی ہے۔' حکمران طبقے کے خیالات و تصورات ہر تاریخی دور میں غالب تصورات رہے ہیں۔ حکمران طبقہ اپنے تصورات کو تمام اولین تصورات سے ممتاز کرنے کے لیے انھیں ابدی سچائیوں کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اپنے اقتدار اور حاکمیت کا دوام وہ اپنے تصورات کے ابدی وازلی اعلیٰ معیار پر رکھتا ہے۔ بخارن کا مقالہ مارکسی نکتہ نظر کی ایک بہترین مثال تھا لیکن کانفرنس میں سب سے زیادہ نزاعی اور مؤثر مقالہ روسی طبیعیات دان بورس ہیزن نے پیش کیا جس کا عنوان تھا 'نیوٹن کی 'پرنسپیا' کی سماجی اور معاشی جڑیں' (The Social and Economic Roots of Newton's 'Principia')۔ بورس ہیزن نے اپنے مقالہ میں نیوٹن کے دور، جس کے دوران انگلش خانہ جنگی (۱۶۶۰ء۔۱۶۹۲ء) ہوئی، کی معیشت، ٹیکنالوجی (بالخصوص کان کنی)، آلات حرب، مواصلات، آبی ذرائع، نقل وحمل، جنگ کے دوران اختیار کی جانے والی تقسیم کار اور دور مار کرنے والی توپوں کے استعمال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نیوٹن کی طبیعیات میں زیر مطالعہ لائے جانے والے مسائل کی اصل بنیاد اس زمانے کے معاشی و تکنیکی مسائل میں ہے اور جن کے حل کے لیے ابھرتی ہوئی انگلش بورژوازی سرگرم تھی۔ بورس ہیزن کے مقالے نے بہت سے سائنس دانوں کو براہ راست متاثر کیا۔ گو پیشہ ور سائنس کی تاریخ کے ماہرین نے اس کا براہ راست اثر قبول نہیں کیا لیکن بالواسطہ طور پر سائنس کی تاریخ نویسی میں سائنس اور سائنس دانوں پر ان کے دور کے معاشی، سماجی، ثقافتی اور فلسفیانہ ماحول اور افکار کا اثر قبول کر لیا گیا۔

مارکسی نکتہ نظر کو اپنانے والے برطانوی طبیعیات دان جے۔ ڈی برنال (J.D. Bernal) نے اپنی مشہور زمانہ *Science in History* ۱۹۵۴ء میں تحریر کی۔ جوزف نیڈہام (Joseph Needham) نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف 'چین میں سائنس اور تہذیب' *(Science and Civilization in China)* لکھنی شروع کی جس کی پہلی جلد ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اب تک اس تصنیف کی سات جلدیں چودہ حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے برطانوی مؤرخین تاریخ سائنس جے۔ جی۔ کراوتھر (J.G. Crowther)،

ہائمن لیوی (Hymen Lavy) نے بھی اہم تواریخ سائنس لکھیں۔

سائنس کی تاریخ نویسی کی اس جہت کو خارجیت (Externalism) کا نام دیا گیا۔ گو خارجیت کی ابتدا تو مارکسی تھی لیکن بعد کے غیر مارکسی مصنفین نے اس جہت کے انقلابی عنصر کو خارج کر کے اسے بھی ایک عام فکری رجحان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں سب سے قابل ذکر امریکن رابرٹ کے مرٹن (Robert K. Merton) ہے جس کو ایک طرح سے سائنس کی سماجیات (Sociology of Science) کا بانی کہا جاتا ہے۔ مرٹن نے ہیزن کے مقالے کے بعد سے قابل ذکر تصانیف تحریر کیں جن میں ہیزن کے استدلال کو زیادہ نفاست سے پیش کیا گیا ہے۔ مرٹن نے اپنی تصانیف میں تجربی اور مقداری طرز تحقیق کو فروغ دینے کی کوشش کی جس سے سائنس پر خارجی اثرات کا اظہار زیادہ مؤثر انداز میں ظاہر کیا جا سکے۔ مرٹن اپنی تحقیقات میں بورس ہیزن کے مقالے کی اہمیت کا ہمیشہ ممنون رہا۔

برصغیر میں سائنس کی تاریخ نویسی

سولھویں صدی سے یورپی تاجر اور مبلغین نے برصغیر کے علاوہ چین اور دوسرے مشرق بعید کے ممالک میں آنا جانا شروع کیا۔ مبلغین کے ایک گروہ جسے یسوعیوں (Jesuits) کے نام سے جانا جاتا ہے، مشرقی ممالک میں موجود علمی خزانے کو جمع کرنا شروع کیا۔ فلسفہ، مذہب، ریاضی، فلکیات، علم نجوم اور طب پر تصانیف کو جمع کیا گیا اور انھیں یورپ بالخصوص فرانس میں شائع کیا گیا۔ یسوعیوں کے علاوہ برطانوی اور فرانسیسی مستشرقوں نے برصغیر کے روایتی علوم کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے زیر اثر ہندوستانی کیمیادان پی۔ سی۔ رے (P.C. Ray) نے خارجیت کے نکتہ نظر سے بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں سائنس کی سماجی تاریخ کے موضوع پر پہلی تاریخ لکھی جس کا نام تھا 'ہندو کیمیا کی تاریخ' (*A History of Hindu Chemistry*)۔ اور جس کی دو جلدیں بتدریج ۱۹۰۲ء۔۱۹۰۸ء میں شائع ہوئیں۔ یہ زمانہ برصغیر میں قومی بیداری کا تھا۔ آزادی کی خواہش جڑ پکڑ چلی تھی اور اس کا اظہار مختلف مرحلوں پر سیاسی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں ہو رہا تھا۔ اس دور میں لکھی گئی عمومی تواریخ کی طرح برصغیر میں سائنس کی تاریخ کو بھی نیشنلسٹ حوالے سے لکھا جا رہا تھا۔ رے کی تاریخ سائنس کے علاوہ وہیول کے نکتہ نظر کو اپناتے

ہوئے بی۔این۔سیل نے *The Positive Sciences of the Ancient Hindus* ۱۹۱۵ء میں شائع کی۔سیل اور رے جیسے اہم لوگوں نے برصغیر میں سائنس کے فروغ کے لیے ثقافتی فضا ہموار کی۔یونیورسٹیوں میں سائنس کی تدریس وتحقیق شروع کرنے پر زور دیا گیا۔نوآبادیاتی حکومت سے آزاد سائنسی تدریس وتحقیق کے ادارے قائم ہوئے۔بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جمشید جی ٹاٹا نے بنگلور میں پوسٹ گریجویٹ تحقیقی ادارہ 'انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز' (Indian Institute of Sciences) قائم کیا۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں سائنس کی تاریخ کا ڈسپلن (Discipline) برصغیر میں قائم ہوگیا۔۱۹۲۷ء۔۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے میں اے۔این سنگھ اور بی۔دتا نے برصغیر میں ریاضی کی تاریخ پر اعلیٰ درجہ کا کام کیا لیکن ان کا کام داخلیت (Internalism) کے حوالے سے تھا۔معاشی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اثرات کا کوئی ذکر نہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر آزاد ہوا۔نوآبادیاتی قوت رخصت ہوئی۔ہندوستان اور پاکستان دو آزاد ملک بن کر اُبھرے۔سائنس کی تاریخ کے سلسلے میں جو پیش رفت بیسویں صدی میں ہوئی تھی وہ ہندوستان میں تو اور آگے بڑھتی گئی لیکن پاکستان میں سائنس کی تاریخ نویسی کو ایک بہت بڑا دھچکا لگا اور بطور ایک ڈسپلن کے پاکستان میں سائنس کی تاریخ نویسی کی کوئی ترقی نہ ہوسکی۔

ہندوستان میں اس کے برخلاف سائنس کی تاریخ پر کام بہت آگے بڑھا۔سائنس کی تاریخ کو باقاعدگی دینے کے لیے دو سائنسی اکیڈیمیاں آگے آئیں۔نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز آف انڈیا جو بعد میں انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی میں تبدیل ہوئی اور کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) نومبر ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی۔یونیسکو کے تعاون سے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف سائنسز آف انڈیا نے ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا جس میں انڈیا میں سائنسز کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا گیا جس میں سائنس کی تاریخ کو علاقے کی سماجی، ماحولیاتی اور معاشی تاریخ سے جوڑ کر دیکھا گیا۔

۱۹۶۶ء میں انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی (INSA) نے تاریخ سائنس کے ایک جریدے Indian Journal of the History of Sciences کا اجرا کیا۔اس رسالے میں خارجیت اور داخلیت دونوں ہی نکتہ نظر جگہ پاتے ہیں۔سائنس کی سماجی تاریخ میں دو اور اہم

نام ہیں جنھوں نے برصغیر میں سائنس کی تاریخ کو اس کے ثقافتی، مذہبی، سیاسی اور معاشی پس منظر میں دیکھا ہے۔ دیبی پرشاد چٹوپادھیا (Debi Prasad Chattopadhyaya) نے اپنی 'تصانیف' میں ثابت کیا ہے کہ عہد قدیم کے برصغیر میں فلسفہ کے مادیت کے اسکول (Materialist School) جیسے لوکیاٹا (Lokyata) اور بعد کے آیورویدک برصغیر میں دنیا کو سائنسی نکتہ نظر سے سمجھنے کے لیے فکری فریم ورک فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یورپ کی طرح برصغیر میں بھی حکمرانوں کی سرپرستی میں مذہبی کٹرپن نے سائنسی طرز فکر کی بیخ کنی کی۔ عبدالرحمٰن نے عہد وسطیٰ کے برصغیر میں سائنس کے عمل کو ضبط تحریر کیا اور سائنس پر عہد وسطیٰ کے سیاسی، سماجی پس منظر اور کونیات کے اثر کو آشکار کیا۔

عبدالرحمٰن نے انڈین کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (ICSIR) کے تحت ایک ذیلی ادارہ نیشنل انسٹیٹیوٹ فار سائنس، ٹیکنالوجی اینڈ ڈویلپمنٹ اسٹڈیز (NISTADS) قائم کیا جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ کو سیاسی، ثقافتی اور معاشی پس منظر میں ترقی کے عمل کے ساتھ منسلک کر کے دیکھا ہے۔

عبدالرحمٰن کے علاوہ اس ادارے کے دھروو رائنا (Dhruv Raina) اور سید عرفان حبیب نے بھی سائنس کی تاریخ پر بہت اہم کام کیا ہے۔

ساتویں دہائی میں سائنس کی تاریخ نویسی میں نوآبادیاتی سائنس کی جہت کا تعارف کروایا گیا۔ اس میدان کے ایک ماہر دیپک کمار (Deepak Kumar) کے مطابق:

> 'نوآبادیاتی سائنس' ایک ماتحت (Dependent) سائنس ہے جس میں اطلاقی سائنس میں نتیجہ خیز تحقیق، محض تجسس کی بنا پر کی جانے والی بنیادی سائنس کی تحقیق پر فوقیت رکھتی ہے۔

نوآبادیاتی ممالک میں اور برصغیر میں نوآبادیاتی دور میں سائنس کو صرف اسی نکتہ نظر سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ دیپک کمار کی کتاب 'سائنس اور راج' (*Science and the Raj*) پہلی دفعہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اس طرز فکر کو اختیار کرتے ہوئے ظہیر بابر نے اپنی کتاب *The Science of Empire* شائع کی۔

نوآبادیاتی سائنس کے علاوہ سائنس کی تاریخ نویسی میں ایک جہت پس جدیدیت

(Postmodernism) تاریخ سائنس کی ہے جس کے برصغیر میں مبلغ آشیش نندی (Ashish Nandy) ہیں۔ اس طرز فکر کو گیان پرکاش (Gyan Prakash) نے اپنی کتاب 'جدید انڈیا کی سائنس اور تخیل' میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

مختصراً ہندوستان میں تاریخ نویسی اور عمومی طور پر سائنس کی تاریخ نویسی خاص طور پر اچھی حالت میں ہیں۔ سائنس کی تاریخ مختلف جہتوں میں لکھی جارہی ہے۔ بڑی کانفرنسیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف پاکستان میں تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ سائنس کی تاریخ پر تحقیقی کام تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

پاکستان میں سائنس کی تاریخ لکھتے ہوئے ہمیں برصغیر میں سائنس کی تاریخ سے ناطہ جوڑنا ہوگا۔ سائنس کو سائنس دانوں کو اور ان کی سرگرمیوں کو پاکستان کے ثقافتی، معاشی، مذہبی اور سیاسی سیاق وسباق سے ملا کر دیکھنا ہوگا۔ اس میدان میں برصغیر اور باقی دنیا میں ہونے والی تحقیق کو سمجھ کر اپنانا ہوگا۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ/عدم فروغ کو عالمی سرد جنگ، اس میں پاکستان کے کردار، افغان خانہ جنگی میں پاکستان کے کردار اور اس کے نتیجے میں فروغ پانے والی مذہبی عدم رواداری کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔

کتابیات

Babur, Zaheer, *The Science of Empire,* SUNY Press, 1996.

Bernal, J.D., *Science in History,* London: 1954.

Bose, D.M., (ed.), *A Concise History of Science in India.*

Bukharain, N.I., *Science at the Crossroads* (1931), 2nd Edition, London: 1971.

Chattopadhyaya, Debi Prasad, *Lokyata: A Study in Ancient Indian Materialism,* 1959.

___, (ed), *History of Science and Technology in Ancient India,*

1991.

___, *Science and Society in Ancient India,* 1977.

Habib, S. Irfan and Raina, Dhruv (eds.), *Situating the History of Science: Dialogues with Joseph Needham,* India: OUP, 1999.

___, *Domesticating Modern Science,* Delhi: Tulika, 2004.

Jain, Ashok (ed.), *Fifty Years of Science and Technology in India.*

Kumar, Deepak, *Science and the Raj*, India: OUP, 1995.

Merton, Robert K., *Science, Technology and Society in Seventeenth Century England*, New York: 1970.

Needham, Joseph, *Science and Civilization in China,* 7 Vols., 14 parts, Cambridge University Press, 1954.

Prakash, Gayan, *Another Reason: Science and The Imagination of Modern India,* Princeton University Press, 1999.

Ray, P.C., *A History of Hindu Chemistry,* Calcutta: 2 Vols., 1902 & 1908.

Rehman, Abdur, (ed.), *History of Indian Sciences, Technology and Culture AD 1000-1800,* India: OUP, VOl-III, Part I of the multivolume Project of Indian Science, Philosophy and Culture Series.

Sarton, George, *Introduction to History of Sciences,* 3 Vols., Williams & Wilkins, Baltimore: 1927-47.

Seal, B.N., *The Positive Sciences of the Ancient Hindus*, London: 1915.

Whewell, William, *History of Inductive Science: From the Earliest*

to the Present Times, 3 Vols., London: 1837.

ہندوستان میں سائنس کی تاریخ سے متعلق شائع ہونے والے جریدے

Indian Journal of History of Science, Indian National Science Academy.

Science, Technology and Society, Sage Publications, Delhi.

عہد صوفیاء کی تاریخ کیسے لکھی گئی؟

غافر شہزاد

صوفیاء کے ہاں باقاعدہ تاریخ نویسی کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملتی تذکرہ جات اور ملفوظات پر مشتمل کتب پڑھیں تو ہمیں گذشتہ ایک ہزار برسوں پر پھیلی اس عہد کی تاریخ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں یقین آنے لگتا ہے کہ لشکر کشی کے بغیر دلوں کو فتح کرنے والے صوفیاء اگر ایک جانب سلوک کی منازل طے کر رہے تھے تو دوسری جانب عام لوگوں کے دلوں میں بھی گھر کئے ہوئے تھے یہ تذکرہ جات اور ملفوظات تاریخ نویسی کے مقصد کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھے گئے اور نہ ہی ان کا مقصد صوفیاء کی شخصیت اور کردار نویسی تھا بلکہ یہ تو ان صوفیاء کے حوالے سے یاد رہ جانے والی باتیں اور یادیں تھیں جن کو عقیدت کی بنیاد پر قلم بند کیا گیا، چشتیوں کے ان ملفوظات اور تذکرہ جات کو بنیاد بنا کر اگر خلیق احمد نظامی[1] اور پروفیسر محمد حبیب[2] نے اولیاء کرام کی شخصیت، تعلیمات اور طرزِ زندگی پر بھرپور کتب تصنیف کی ہیں تو اسے ان کی تحقیقی عرق ریزی اور تخلیقی صلاحیت کا اعجاز سمجھنا چاہئے وگرنہ ان تذکرہ جات اور ملفوظات میں تضادات، کنفیوژن، ابہام اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے عمومی فہم وفراست رکھنے والا شخص تو اس ابہام اور کنفیوژن کے سامنے اپنا ماتھا پکڑ لیتا ہے۔ تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان ملفوظات اور تذکرہ جات کی مدد سے صوفیاء کے عہد کی تاریخ قلم بند کی جائے۔

اس مضمون کے پہلے حصے میں قدیمی تذکرہ جات اور ملفوظات کا اس پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے[3] کہ صوفیاء کے ملفوظات کو قلم بند کرنے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا اور ان کو تحریر کرنے والے اور جو تحریر کیا گیا ہے دونوں کس درجہ تک قابل اعتبار ٹھہرتے ہیں۔ مضمون کے دوسرے حصے میں بعد ازاں تحریر کئے جانے والے تذکرہ جات میں پیدا ہونے والے تضادات اور باہمی تقابلی جائزے سے اُن کی صداقت کے معیار و اعتبار پر بات کی گئی ہے اور مضمون کے آخری

حصے میں کوشش کی گئی ہے کہ اگر تحریری شواہد صوفیاء اور ان کے عہد کی تاریخ کو پیش کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں تو پھر ان سے منسوب مفروضوں اور تفصیلات کی صداقت کی جانچ اور پرکھ کے لئے کونسا ایسا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے جو قابل اعتبار ٹھہرتا ہے۔ ہم اپنے مضمون کا آغاز انہی موجود تذکرہ جات اور ملفوظات سے کرتے ہیں کہ مؤلفین نے ان کو قلم بند کرتے ہوئے کونسا طریقہ کار اختیار کیا اور کس قدر احتیاط سے کام لیا اور کس حد تک ان کی صداقت ہمارے لئے قابل اعتبار ٹھہرتی ہے۔

سب سے پہلے فوائد الفواد کو لیجئے جسے امیر حسن علاء سجزی المعروف خواجہ حسن دہلوی نے مرتب کیا۔ یہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ امیر حسن علاء سجزی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی محفل میں حاضر رہتے شیخ اپنے مریدوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لئے جو کچھ ارشاد فرماتے، امیر حسن قلم بند کرتے جاتے۔ ان محفلوں میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے تصوف، تزکیۂ نفس اور اولیاء کرام کی تعلیمات اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ فرمایا امیر حسن علاء سجزی نے اسے قلم بند کیا۔ امیر خسرو نے فوائد الفواد ہی کے بارے میں ایک مرتبہ نہایت حسرت سے فرمایا تھا

کاش میری ساری کتابیں حسن لے لیتے لیکن یہ کتاب (فوائد الفواد)
میرے قلم سے ہوتی۔

فوائد الفواد ۳ شعبان ۷۰۷ھ سے ۲۰ شعبان ۷۲۲ھ تک کی ۱۸۸ مجالس پر مشتمل کتاب پانچ جلدوں پر محیط ہے۔ جلد اوّل چونتیس مجالس، جلد دوئم اڑتیس مجالس، جلد سوئم سترہ مجالس، جلد چہارم سرسٹھ مجالس پر مشتمل ہے اور یہ بارہ سال کے عرصہ پر محیط ہے جبکہ جلد پنجم بتیس مجالس پر مشتمل ہے اور تین سال کے عرصہ پر محیط ہے، یوں کل پندرہ سالوں میں یہ پانچ جلدیں تیار ہوئیں۔ فوائد الفواد میں بیان کی جانے والی حکایت میں حوالے کے طور پر شیخ نجیب الدین متوکل، شیخ فریدالدین، شیخ ابوسعید ابوالخیر، مولانا علاء الدین اصولی، شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی اور شہاب الدین سہروردی جیسے صوفیاء کا ذکر ہے جو ان مجلسوں کے انعقاد کی صداقت کے لئے ایک طرح کی گواہی ہے۔

فوائد الفواد کو قلم بند کئے جانے کے بارے میں اٹھائیسویں مجلس میں خواجہ نظام الدین

اولیاء کے علم میں لاتے ہوئے امیر حسن علاء سجزی فرماتے ہیں۔

> ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا میں حضرت کی غلامی سے وابستہ ہوں ہر بار جب آپ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی ہے تو اس موقع پر آپ کی زبان گوہر فشاں سے جو ارشادات و افادات سنتا ہوں خواہ وہ اطاعت و عبادت کے بارے میں، وعظ و نصیحت و ترغیب کے باب میں، جو روح افزاء کلمات اس کاتب الحروف کے کانوں تک پہنچے میں نے چاہا کہ وہ کلمات اس بیچارے کے لئے دستور العمل بنیں، بلکہ اس کے حال کے لئے دلیل راہ ہوں، میں نے اپنی سمجھ کے مطابق انہیں قلم بند کرلیا ہے۔[۴]

ان ارشادات کے موضوعات کا تعین جیسا کہ اوپر کیا گیا ہے، وہیں امیر حسن علاء سجزی نے ان ارشادات کو قلم بند کرنے کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے بارہا ارشاد ہوا ہے کہ مشائخ کی کتابیں اور ان کے ارشادات جو انہوں نے سلوک تصوف کے بارے میں فرمائے ہیں نظر میں رہنے چاہئیں اور چونکہ کوئی اور مجموعہ آپ کے ارشادات کا موجود نہیں ہے اس لئے جو کچھ بھی سنا اسے قلم بند کرلیا ہے، مزید لکھتے ہیں کہ اب تک میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، اب آپ کے حکم کا منتظر ہوں، جیسے آپ چاہیں۔

امیر حسن علاء سجزی کی یہ باتیں سن کر خواجہ نظام الدین اولیاء نے وہ کاغذات دکھانے کے لئے کہا۔ آپ نے مطالعہ کرنے کے بعد پسند فرمایا اور ارشاد کیا 'تم نے خوب لکھا ہے' ایک دو جگہیں کاغذ پر خالی دیکھ کر شیخ نے استفسار کیا تو امیر حسن علاء سجزی نے بتایا اس سلسلے کے باقی ماندہ کلمات اچھی طرح معلوم نہ تھے اس لئے جگہ خالی چھوڑ دی[۵] خواجہ نظام الدین اولیاء نے باقی ماندہ کلمات بیان کئے اور یوں یہ مکمل ہوگئے۔

اس ساری وضاحت کے بعد کہ جو فوائد الفواد میں نہایت تفصیل سے موجود ہے، ان ملفوظات کی صداقت پر کسی قسم کا شائبہ نہیں رہنا چاہئے۔ ویسے بھی لکھنے والا اور جس کے بارے میں لکھا جارہا ہے، دونوں بالمشافہ موجود ہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لکھتے ہوئے امیر حسن علاء سجزی نے لفظ بہ لفظ نہ لکھا ہو اور گفتگو کی زبان کو تحریر میں لاتے ہوئے قدرے بہتر الفاظ استعمال کردیئے ہوں جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے بھی مترشح ہے۔ ان کلمات کی تحریری صداقت کا اندازہ درج ذیل

اقتباس سے بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ جب امیر حسن علاء سجزی فرماتے ہیں۔

جب حضرت خواجہ یہ حکایت بیان کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو ان پر رقت و گریہ کچھ اس طرح غالب آ گیا کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا، بخوبی سمجھ میں نہ آیا، اس رقت و گریہ کے دوران میں یہ دو شعر ان کی زبان مبارک سے ارشاد ہوئے، معلوم نہیں یہ انہوں نے احمد سے روایت کئے یا خود کہے۔[6]

۲۴ محرم ۷۱۴ ہجری کو فوائد الفواد کی جب پہلی جلد مرتب ہو گئی تو خواجہ نظام الدین اولیاء کے فرمان کے مطابق امیر حسن علاء سجزی نے اس پہلی جلد کو آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس کا مطالعہ فرمایا اور اسے پسند کرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا 'تم نے خوب لکھا ہے درویشانہ انداز میں لکھا ہے اور نیک نامی بھی حاصل کی ہے۔'[7]

ایک اور مجلس میں خواجہ نظام الدین اولیاء امیر حسن علاء سجزی سے دوبارہ پوچھتے ہیں کہ میری جو باتیں سنتے ہو تو انہیں کیا تم لکھ لیتے ہو، آپ نے عرض کیا جی ہاں لکھ لیتا ہوں، مزید تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا، کیا تمہیں یہ باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس پر امیر حسن سجزی نے کہا 'عموماً سب یاد رہ جاتی ہیں اور جو یاد نہیں رہتیں اور ٹھیک ٹھیک قلم بند نہیں ہوتیں ان کے لئے میں کاغذ سفید چھوڑ دیتا ہوں تا کہ آپ سے کبھی دوسری بار سن کے لکھ لوں۔'[8]

یہی وجہ ہے کہ پروفیسر محمد حبیب نے صرف فوائد الفواد کو ہی قابل اعتبار ٹھہرایا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے 'آج کے عہد میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے فوائد الفواد تاریخی اہمیت کی حامل ہے یہ ایک معیاری کام ہے جس سے چشتی صوفیاء کی زندگی اور تعلیمات کا پتہ چلتا ہے اور اس کی نسبت سے دیگر تمام کاموں کی درستگی اور اصلیت کو پرکھا جا سکتا ہے۔'[9]

خواجہ معین الدین چشتی کے ملفوظات پر مشتمل 'دلیل العارفین' کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے مرتب کیا فوائد الفواد میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا، ممکن ہے یہ فوائد الفواد کے بعد تحریر کی گئی ہو 'دلیل العارفین' میں کل بارہ مجالس ہیں جن میں مجموعی طور پر چار اہم موضوعات فقر و ثواب، مکتوبات و تسبیح، وظائف و اوراد، سلوک اور اس کے فوائد کے حوالے سے خواجہ معین الدین چشتی نے گفتگو کی ہے۔

'دلیل العارفین' کی اولین مجلس بغداد میں ہوئی جس میں خواجہ معین الدین چشتی نے نماز اور خدمت مرشد کے بارے میں گفتگو کی۔ اسی روز خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھ پر شرف بیعت حاصل کیا۔ دلیل العارفین کی گیارہویں مجلس میں اطلاع مل جاتی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اب اجمیر شریف روانہ ہونے والے ہیں اور یوں بارہویں اور آخری مجلس اجمیر شریف میں منعقد ہوتی ہے اور اس مجلس کا موضوع گفتگو 'ملک الموت' کے بارے میں ہے۔ 'دلیل العارفین' کی ان بارہ مجالس میں ہر مجلس کے آغاز میں مجلس میں موجود صوفیاء کے نام بھی دیئے گئے ہیں جو وہاں اس وقت موجود تھے اور ان صوفیاء میں وقتاً فوقتاً شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ اجل شیرازی، شیخ سیف الدین، شیخ داؤد کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی، شیخ تاج الدین محمد صفاہانی، شیخ جلال الدین، شیخ محمد احمد چشتی کے علاوہ کئی دیگر بزرگ شامل رہے ہیں۔

'دلیل العارفین' میں بیان کئے گئے موضوعات اور انداز تحریر سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فوائد الفواد کی طرح تحریر کی جانے والی کتاب نہیں ہے بلکہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے بعد ازاں اپنی یادداشت کے سہارے اسے تحریر کیا اور بارہ مجالس کے موضوعات میں ایک تسلسل اور ترتیب بھی پیدا کر دی اور یوں موضوعات اور ان کی ترتیب میں ایک شعوری کاوش نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر پی ایم کیوری نے بجا طور پر لکھا ہے ''دلیل العارفین'، 'خیر المجالس' کے بعد لیکن 'سیر الاولیاء' سے پہلے کہیں زمانے میں تحریر کی گئی یعنی ۱۳۵۵۔۱۳۸۵ء کے درمیانی عرصہ میں۔'[۱۰]

امیر خورد کی مرتب کردہ 'سیر الاولیاء' وہ اولین تذکرہ ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت (۱۳۵۱ء۔۱۳۸۸ء) کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا۔ امیر خورد حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے جلیل القدر خلفاء کے حالات کا عینی شاہد تھا اس کے دادا اور نانا خواجہ فرید الدین گنج شکر کے مرید اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی محفلوں کے فیض یاب تھے لہٰذا امیر خورد نے جو کچھ 'سیر الاولیاء' میں قلم بند کیا وہ اس کے دادا اور نانا کے توسط سے ان چشتی صوفیاء کے بارے میں اس تک پہنچا اور اس نے ان روایات کو بعینہٖ قلم بند کیا اور بقول اعجاز الحق قدوسی 'یہ تذکرہ اپنے وثوق، استناد اور شہادت عینی کے باعث بڑی اہمیت رکھتا ہے۔'[۱۱]

امیر خورد 'تاریخ فیروز شاہی' کے مؤلف ضیاء الدین برنی کے ہم عصر اور گہرے دوست تھے دونوں ہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ضیاء الدین برنی نے اس عہد کے بادشاہوں

اور سلاطین کے احوال کو بیان کر کے اس وقت کی سیاسی اور ریاستی تاریخ سپرد قلم کی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی ۱۳۵۷ء میں مکمل ہوئی جبکہ سیر الاولیاء اس کے بعد تحریر کی گئی، یہ بات اس لئے بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سیر الاولیاء میں ضیاء الدین برنی اور 'تاریخ فیروز شاہی' دونوں کا ذکر ملتا ہے۔

'سیر الاولیاء' کے بارے میں خواجہ امیر خورد رقم طراز ہیں کہ جب ان کی عمر پچاس برس ہوگئی اور انہوں نے کوئی ایسا کام نہ کیا جو بارگاہ بے نیاز کے شایان شان ہوتا تو ان کے دل میں عالم غیب سے ایک دن خیال پیدا ہوا کہ انہیں اولیاء اللہ کے حالات احاطۂ تحریر میں لانے چاہئیں۔ اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے انہوں نے شیخ ابوالقاسم قشیری کے 'رسالہ القشیریہ' اور شیخ علی ہجویری کی تصنیف 'کشف المحجوب' سے استفادہ کیا اور انہوں نے 'سیر الاولیاء' میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

'سیر الاولیاء' کے پہلے پانچ ابواب میں صوفیاء اور ان کی شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ آخری پانچ ابواب میں تصوف سے متعلق معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ ۸۴۰ صفحات کی اس کتاب میں ۴۰۷ صفحات پر کسی نہ کسی حوالے سے خواجہ نظام الدین اولیاء کا ذکر موجود ہے جبکہ ۳۳۴ صفحات پر خواجہ فرید الدین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اعجاز الحق قدوسی نے 'سیر الاولیاء' کے تعارف میں مزید لکھا ہے:

> عہد ہمایوں کے مشہور تذکرہ نگار شیخ حامد بن فضل اللہ جمالی کے تذکرے 'سیر العارفین' (۱۵۳۱ء تا ۱۵۳۵) سے لے کر عہد جہانگیری کے تذکرہ نگار صاحب 'گلزار مدینہ' اور صاحب 'اخبار الاخیار' یہاں تک کہ مفتی غلام سرور لاہوری کے ضخیم تذکرے 'خزینۃ الاصفیاء' تک سب اس کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔[۱۲]

خواجہ فرید الدین مسعود کو گنج شکر اور حضرت علی ہجویری کو گنج بخش کے نام سے ہر خاص و عام جانتا ہے، چشتی صوفیاء کے حوالے سے تحریر کئے جانے والے تذکرہ جات اور ملفوظات میں اگر خواجہ فرید الدین مسعود کو گنج شکر کہے جانے کی توجیہات کا جائزہ لینا شروع کریں تو اور بھی الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۳۵۱ء۔۱۳۸۸ء کے دوران میں تحریر کی جانے والی 'سیر الاولیاء' میں امیر خورد لکھتا ہے کہ مسلسل روزے کی حالت میں رہنے کے سبب شدید بھوک کے عالم میں کچھ کنکر خواجہ فرید الدین مسعود کے منہ میں جا کر شکر بن گئے تھے۔[۱۳] اس لئے آپ کو گنج شکر پکارا جاتا ہے۔

سولہویں صدی میں تحریر کی جانے والی 'سیر العارفین' کا مصنف مولانا جمالی لکھتا ہے کہ ایک دن خواجہ فرید اپنے مرشد کو ملنے گئے انہوں نے کھڑاؤں پہنی ہوئی تھیں اور راستے میں کیچڑ تھا وہ سات دن سے روزہ کی حالت میں تھے اور بہت کمزور تھے وہ پھسل کر زمین پر گرے کچھ سنگ ریزے ان کے منہ میں چلے گئے تو وہ شکر بن گئے۔ مرشد کے گھر سے واپس آئے تو راستے میں آپ نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا 'دیکھو شیخ فرید۔۔۔ گنج شکر آ رہا ہے'۔[۱۴]

تیسرا حوالہ ہمیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سترہویں صدی میں تالیف کردہ تذکرے 'اخبار الاخیار' میں ملتا ہے۔ ان کے بقول ایک دن ایک تاجر خواجہ فرید الدین مسعود سے ملنے اجودھن میں آتا ہے جس کے پاس بہت سی شکر تھی۔ شیخ فرید کے شکر مانگنے پر وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس شکر نہیں نمک ہے، اس پر شیخ فرید کہتے ہیں 'نمک ہی ہوگا' بعد میں جب تاجر بوریاں کھولتا ہے تو وہ نمک میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہیں وہ معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو شیخ فرید دعا کرتے ہیں تو نمک دوبارہ شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے، تب سے آپ کو گنج شکر کہا جانے لگا۔[۱۵]

اس حوالے سے سب سے دلچسپ بات 'تاریخ فرشتہ' میں درج ہے۔[۱۶] فرشتہ کے بقول خواجہ فرید کو شروع سے ہی شکر پسند تھی۔ جب آپ نماز پڑھتے تو آپ کی والدہ جائے نماز کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتی جب آپ کی عمر بارہ سال ہوگئی آپ کی والدہ نے آپ کے جائے نماز کے نیچے شکر کی پڑیا رکھنی بند کر دی مگر کچھ عرصہ بعد انہیں یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ شیخ فرید کو شکر کی پڑیا بدستور مل رہی تھی۔ اس سبب سے آپ گنج شکر مشہور ہو گئے۔

چشتی سلسلے کے صوفیاء کے حوالے سے قدیم ترین اور مستند کتاب 'فوائد الفواد' ہے جس میں نظام الدین اولیاء نے خواجہ فرید کا اپنی گفتگو میں سینکڑوں مرتبہ نام لیا ہے مگر کہیں بھی وہ مرشد کو گنج شکر نہیں کہتے۔ تاہم اس کے بعد کے تذکرہ نگار، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، خواجہ فرید کو گنج شکر پکارتے ہیں اور اس سلسلے میں کئی قسم کی توجیہات بیان کرتے ہیں جن کا ذکر خلیق احمد نظامی نے بھی خواجہ فرید کے حوالے سے اپنی کتاب میں تفصیل سے کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں آنے والے اولین صوفیاء میں حضرت علی ہجویریؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہماری تاریخ کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ حضرت علی ہجویریؒ کب لاہور وارد ہوئے اور انہوں نے کب وفات پائی، سبھی محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ مختلف مؤلفین کے تجویز کئے گئے سالِ وصال کے مابین چھ یا سات دہائیوں تک فرق پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی تصنیف 'کشف المحجوب' کے زمانۂ تالیف کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ حضرت علی ہجویریؒ نے 'کشف المحجوب' عربی زبان میں تصنیف کی جسے بعدازاں خلیق احمد نظامی نے مسترد کرتے ہوئے لکھا کہ کتاب کی اصل زبان فارسی ہی تھی۔

داراشکوہ اپنی کتاب 'سفینۃ الاولیاء' (مطبوعہ ۱۶۴۰ء) میں اچانک اطلاع دیتے ہیں کہ حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی گرہ سے ایک مسجد تعمیر کروائی تھی لاہور کی دیگر مساجد کے مقابلے میں اس کا قبلہ رخ قدرے جنوب کی جانب تھا جس پر علماء نے اعتراض کیا اور ایک روز آپ نے تمام علماء کو بلایا اور نماز پڑھائی اور پھر کہا کہ دیکھو درست قبلہ کی سمت کدھر ہے، سب کو اپنی کھلی آنکھوں سے قبلہ نظر آ جاتا ہے۔ اب اس واقعے کا اس سے قبل کہیں ذکر نہیں ہے۔ 'سفینۃ الاولیاء' حضرت علی ہجویریؒ کی وفات کے چھ سو سال بعد تالیف ہوتی ہے۔ داراشکوہ بغیر کسی حوالے کے یہ واقعہ حضرت علی ہجویری کی نسبت سے بیان کر دیتا ہے جبکہ 'فوائد الفواد' میں (جو کہ چودھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں تالیف ہوئی) یہی واقعہ خواجہ حسن افغانی کی نسبت سے درج کیا گیا ہے۔ [۱۷]

'فوائد الفواد' کی اکتیسویں مجلس (جلد اوّل) میں لاہور اور لاہور کے مزاروں کے حوالے سے خواجہ نظام الدین اولیاء کی گفتگو کا اندراج کیا گیا ہے بلکہ شیخ علی ہجویری کے لاہور آنے کے واقعہ کو بھی بیان کیا گیا ہے [۱۸] کہ جب ان کے مرشد نے انہیں لاہور جانے کا حکم دیا تھا مگر آپ کی تعمیر کردہ مسجد کے درست قبلہ رخ کے تعین کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی ہی لاپرواہی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضرت علی ہجویریؒ کی پائنتی جانب کھڑے ہو کر یہ شعر 'گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا۔۔۔ ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما' پڑھنے کے بارے میں 'خزینۃ الاصفیاء' اور 'تحقیقات چشتی' کے مصنفین برتتے ہیں جو آپ کے وصال سے کم و بیش آٹھ سو سال بعد اس شعر کو خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کرتے ہیں بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یہ شعر حضرت علی ہجویریؒ کے بارے میں آپ کے مزار کی جنوبی جانب کھڑے ہو کر اس وقت پڑھا جب

ان کو یہاں سے ولایت ملی۔

یہ شعر اور آپ کی مقبولیت بحیثیت گنج بخش اگر پہلے سے ہوگئی ہوتی تو یقیناً 'فوائد الفواد' کا مصنف آپ کو 'شیخ علی ہجویری'[19] اور 'سفینۃ الاولیاء' کا مصنف آپ کو شیخ پیر علی ہجویری[20] کے بجائے حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری لکھتا اور 'سفینۃ الاولیاء' کا مصنف 'یہ کتاب (کشف المحجوب) درحقیقت ایک کامل رہنما ہے اور کتب تصوف میں ایک مرشد کامل'[21] اور 'فوائد الفواد' میں خواجہ نظام الدین اولیاء 'اگر کسی کا پیر نہ ہو جب وہ اس کتاب کو پڑھے گا اسے پیر مل جائے گا'[22] کہنے کے بجائے یقیناً یہ شعر دہراتے:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

اسی طرح خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ حضرت علی ہجویریؒ پر چلّہ کشی کے حوالے سے ہمیں اولین معلومات 'تحقیقات چشتی' (مطبوعہ ۱۸۶۴ء) اور 'خزینۃ الاصفیاء' (مطبوعہ ۱۸۶۵ء) میں پہلی بار ملتی ہیں اور ساتھ یہ بھی درج ہے کہ درگاہ حضرت علی ہجویریؒ کے مجاورین کی زبانی یہ تمام باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ کہنے والے تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ حضرت علی ہجویریؒ کے جسد مبارک کو یہاں نہیں بلکہ قلعہ لاہور کے اندر کہیں دفن کیا گیا تھا۔ اب جس سرزمین پر تاریخ لکھی ہی نہ گئی ہو وہاں اس طرح کے مفروضے قائم کر لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونا چاہئے۔ 'تحقیقات چشتی' کے مصنف نور احمد چشتی اور 'خزینۃ الاصفیاء' کے مصنف غلام سرور لاہوری نے اپنے کشف کے زور پر انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں کئی صدیاں پہلے موجود اولیاء اللہ اور ان کے مزارات سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں کہ ان صوفیاء کا تشخص ان کے درمیان ایک تمسخر بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان میں تو پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی جیسے صاحب نظر اور سنجیدہ مورخین نے نہایت عرق ریزی سے کام کرتے ہوئے چشتی صوفیاء کے حوالے سے قارئین کو کئی خود ساختہ کہانیوں اور مفروضوں سے محفوظ کرتے ہوئے صوفی ازم کی تاریخ قلم بند کی ہے مگر ہمارے ہاں ایسی سنجیدگی اور عرق ریزی سے اس موضوع پر ابھی کام شروع نہیں ہوا۔

بلکہ ہمارے مؤلفین ابھی تک 'تحقیقات چشتی' اور 'خزینۃ الاصفیاء' کو ہی مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ محمد دین فوق نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں 'سوانح حضرت داتا گنج بخش' ۱۹۱۴ء میں

تالیف کی اور نہایت فخریہ انداز سے کتاب کے دیباچے میں اس قلیل عرصہ میں اس تالیف کے لئے داد کے طلب گار ہوئے۔[۲۳] اسی طرح مورخ لاہور محمد دین کلیم قادری نے لاہور کے حوالے سے ۱۷۰ر سے زائد کتب و کتابچے اور مقالہ جات تصنیف کئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 'تذکرہ حضرت میاں میرؒ کو مدّون کرنے کے لئے وہ بھی بمشکل دو ماہ ہی نکال سکے۔[۲۴]

اب جبکہ ہمارے پاس تحریری شواہد کافی نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی قابل اعتبار نہیں ٹھہرتے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مؤلفین کے پاس نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ہمیں ماہرین آثارِ قدیمہ کے طریقہ کار سے مدد لینا ہوگی جو نہایت احتیاط سے کھدائی کرتے ہیں اور پھر دریافت ہونے والے قدیمی آثاروں کے نمونے لیبارٹری میں تجزیہ کے لئے بھجوا دیتے ہیں، ہوسکتا ہے صوفیاء اور ان کی خانقاہوں سے عقیدت میں سرشار لوگوں کو یہ بات ناگوار گذرے مگر ہمارے پاس یہی ایک راستہ بچتا ہے جو ہمیں بہت سے مفروضوں کی صداقت کو جھٹلانے یا ثابت کرنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔ اب اس سلسلے میں ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ ان مزارات کی توسیع کے وقت زیادہ تریوں ہوا ہے کہ پہلے سے موجود کچے صحنوں کی سنگ مرمر سے فرش بندی کر کے ایک لحاظ سے ان آثاروں کو زیر زمین محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ کم وبیش سبھی جگہوں پر اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ نئی مسجد حضرت علی ہجویریؒ کی تعمیر کے وقت جب مسجد کے ایوان کی بنیادوں کے لئے کھدائی کی گئی تو نیچے سے پانی کے کنویں برآمد ہوئے اور دیگر آثار ملے، اگر اس وقت سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان آثاروں کی تجزیہ رپورٹیں حاصل کر لی جاتیں یا پھر تہہ خانے کی کھدائی کے وقت مٹی ہٹاتے ہوئے برآمد ہونے والے آثاروں کی ڈاکومینٹیشن کی گئی ہوتی تو یہ معلومات ایسی بہت سی باتوں کو ہمارے اوپر آشکار کرتیں جن کا تعلق مزار حضرت علی ہجویریؒ کے گردونواح اور وہاں پر صدیوں پہلے کی جانے والی تعمیرات سے بنتا ہے۔

اب ایک سوال جو لوگوں کے ذہنوں میں کلبلاتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کی قبر اسی سطح پر ہے یا اس سے کئی فٹ نیچے گہرائی میں ہے، جہاں چھٹی اور ساتویں دہائی تک لوگ سیڑھیوں سے اتر کے جاتے تھے، اس کا جواب ہمیں صرف آثارِ قدیمہ کی طرز پر کی گئی کھدائی سے ہی مل سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت علی ہجویریؒ اور خواجہ فریدالدینؒ کے موجودہ مزارات کی عمارات کس قدر پرانی ہیں، اس کا جواب بھی صرف آثاریاتی شہادت میں ہی موجود ہے۔ خواجہ فریدالدینؒ کے مزار پر واقع

قدیمی مسجد کو ۱۹۹۹ء میں اس وجہ سے شہید کر دیا گیا کہ اس وقت کامل خان ممتاز، ڈاکٹر احمد نبی خان اور ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کوئی ایسا تحریری حوالہ نہ پیش کر سکے کہ مسجد کی قدامت کا چودھویں صدی سے تعلق بنتا ہے۔[۲۵] اب اگر مسجد کی عمارت میں استعمال ہونے والے سامان تعمیرات کا لیبارٹری تجزیہ اس کے عہد کی شہادت دیتا تو یقیناً ہم اس قدیمی مسجد کو گرانے سے بچانے کا جواز پیدا کر سکتے تھے۔ حضرت بی بی پاک دامناںؒ کا مزار اس وقت شیعہ اور سنّی عقیدت مندوں کے لئے وجہ نزع بنا ہوا ہے بلکہ یہاں تک کہ دربار شریف کے احاطہ کو سنّی اور شیعہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سنّی عقیدت مند یہ کہتے ہیں کہ یہ سید احمد تو ختہ کی بیٹیوں کی قبریں ہیں۔ یہ بزرگ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ہجرت کر کے لاہور آباد ہوئے تھے۔[۲۶] جبکہ تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی ان قبروں کی نسبت حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت عقیلؓ کی صاحبزادیوں سے جوڑتے ہیں۔[۲۷]

۱۹۹۵ء۔۱۹۹۶ء میں جب نئی تعمیرات کے موقع پر زمینی معائنہ کی تحقیقی رپورٹ تیار کروائی گئی تو معلوم ہوا کہ قبرستان بی بی پاک دامناں کی گہرائی بارہ فٹ ہے جس کے بعد اصل زمین کے شواہد ملتے ہیں اور جب بنیادوں کی کھدائی کی گئی تو واقعی اس کے بعد ہڈیوں کے آثار نہیں ملے، اب آثار قدیمہ کے ماہرین زمین کی ان تہوں سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ قبرستان کتنا قدیمی ہے اور یوں حقیقی صورتحال سے آگاہی کے بعد اس جنگ کا خاتمہ ہو سکتا ہے جو شیعہ اور سنّی فرقوں کے مابین صرف ڈیڑھ سو سال قبل کی تحریری شہادتوں پر بنیاد رکھتی ہے۔

خواجہ فرید الدینؒ کے مزار مبارک کی تعمیر نو کی بات کریں تو فوراً کہا جاتا ہے کہ اس مزار میں استعمال ہونے والی ایک ایک اینٹ پر قرآن مجید پڑھا گیا ہے اور اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء اپنے ہمراہ دہلی سے تین سو حفاظ لے کر آئے تھے اگرچہ اس کی بھی کوئی تحریری سند نہیں ہے اگر خواجہ فرید الدینؒ کے مزار مبارک پر استعمال ہونے والی اینٹوں کا تجزیہ کروا لیا جائے تو ان کی قدامت کا علم شاید بہت سے عقیدت مندوں کو اصل صورتحال سے آگاہ کر سکے۔

حضرت علی ہجویریؒ کے مزار مبارک کی جنوبی جانب واقع حجرہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حوالے سے بھی ہمیں ۱۸۶۴ء سے قبل کوئی تحریری شواہد نہیں ملتے۔ نور احمد چشتی نے 'تحقیقات چشتی' میں مجاورین کی زبانی جو احوال معلوم ہوا بغیر تحقیق کئے لکھ دیا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ یہاں

چلّہ کش ہوئے اور آپ کو یہیں سے ولایت ملی، مجاورین کے خاندان سے ہی ایک صاحب [۲۸] تو یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی نے شیخ ہندی کے حجرہ میں چالیس دن چلّہ کشی کی، اس وقت یہ حجرہ موجود ہے اگر کھدائی کے بعد ہمیں آثاریاتی شہادت مل جاتی ہے کہ ان بنیادوں پر آٹھ نو سو سال پہلے تک کوئی حجرہ موجود تھا، تو ہمیں اس کی صداقت پر یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، وگرنہ تحریری شہادت کا تو یہ عالم ہے کہ چشتی سلسلے کے صوفیاء کے ملفوظات میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر چلّہ کشی کا کہیں ذکر موجود نہیں ہے۔

مزار حضرت علی ہجویریؒ پر تعمیر کی جانے والی نئی مسجد کے درست قبلہ رخ کے تعین کے لئے سروے آف پاکستان کے ماہرین سے گزارش کی گئی اور گورنر پنجاب نے ۲۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو اس کی باضابطہ منظوری بھی دی یہ قبلہ رخ تقریباً وہی تھا جو آپ کی مسجد اور مزار مبارک کی نسبت سے نکلتا ہے اس لحاظ سے آپ کی نسبت سے بیان کی گئی داراشکوہ کی وہ کرامت بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جب حضرت علی ہجویریؒ نے مسجد کی تعمیر کے بعد علماء اکرام کو دعوت دی اور ان کو بچشم خود قبلہ نظر آ گیا، بالکل اسی طرح جب خواجہ فریدالدینؒ کے مزار پر نئی مسجد کی تعمیر کے لئے سائنسی بنیادوں پر درست قبلہ رخ کا تعین کیا گیا تو وہ قدیمی مسجد کے قبلہ رخ سے ۱۶ ڈگری کے فرق کے ساتھ تھا اور یوں نئی مسجد کی تعمیر درست قبلہ رخ کے مطابق ہی کی گئی یہ فرق اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب اس کا موازنہ خواجہ فریدالدینؒ کے قدیمی مزار کی نسبت سے کیا جاتا ہے، ایک لحاظ سے سائنسی بنیادوں پر کام کی شروعات ہو چکی ہیں بس اس میں مزید توسیع کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱) خلیق احمد نظامی، *The Life and Times of Sh. Farid-ud-Din*، (لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۷۶ء)

۲) محمد حبیب، 'حضرت نظام الدین اولیاء: حیات و تعلیمات' (لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء)

۳) 'فوائد الفواد' (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء)، 'دلیل العارفین' (ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی) اور 'سفینۃ الاولیاء' کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے اور طوالت سے بچنے کے سبب

مابعد کے تذکرہ جات کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا گیا ہے۔

۴) امیر حسن علاء سجزی، 'فوائد الفواد' (لاہور: محکمہ اوقاف پنجاب، ۲۰۰۱ء)، صفحہ ۸۰۔

۵) ایضاً، صفحہ ۸۱۔۸۲۔

۶) ایضاً، صفحہ ۱۰۸۔

۷) ایضاً، صفحہ ۲۰۴۔

۸) ایضاً، صفحہ ۲۶۶۔

۹) پی ایم کیوری، *Cult and Shrine of Kh. Muin-ud-Din Chisthti of Ajmer* (انڈیا: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء)، صفحہ ۲۳۔

۱۰) ایضاً، صفحہ ۲۴۔

۱۱) اعجاز الحق قدوسی، ''تعارف''، امیر خورد، 'سیر الاولیاء' (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۳۰۔

۱۲) ایضاً، صفحہ ۲۹۔

۱۳) 'سیر الاولیاء'، محولہ بالا، صفحہ ۶۷۔۶۸۔

۱۴) مولانا جمالی 'سیر العارفین' (دہلی: رضوی پریس، ۱۳۱۱ھ)، صفحہ ۴۶۔۴۷۔

۱۵) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، 'اخبار الاخیار' (دہلی: مجتبیٰ پریس، ۱۳۰۹ھ)، صفحہ ۵۲۔۵۳۔

۱۶) محمد قاسم فرشتہ، 'تاریخ فرشتہ'، جلد دوئم (لاہور: دوست ایسوسی ایشن)، صفحہ ۳۳۸۔

۱۷) 'فوائد الفواد'، محولہ بالا، صفحہ ۵۱۔

۱۸) ایضاً، صفحہ ۸۷

۱۹) ایضاً

۲۰) داراشکوہ، 'سفینۃ الاولیاء' (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۵۸ء)، صفحہ ۲۰۹۔

۲۱) ایضاً، صفحہ ۲۱۰۔

۲۲) سید محمد متین ہاشمی، 'سید ہجویر' (لاہور: محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۸۵ء)، صفحہ ۵۸۔۵۹۔

۲۳) محمد دین فوق، 'سوانح حضرت داتا گنج بخش' (لاہور: محکمہ اوقاف پنجاب، ۲۰۰۲)، صفحہ ۱۱۔

۲۴) محمد دین کلیم قادری، 'تذکرہ حضرت میاں میر' (لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، صفحہ ۲۳۔

۲۵) قدیمی مسجد حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر پاک پتن کو گرائے جانے سے محفوظ رکھنے کے لیے محکمہ آثار قدیمہ اور تعمیراتی کمیٹی کے درمیان جنگ دس سالوں (۱۹۸۹ء۔۱۹۹۹ء) تک چلتی رہی۔ بالآخر وزیراعلیٰ پنجاب نے چیف سیکریٹری پنجاب کو بھجوائی ہوئی تلخیص کی توثیق ۹/ اگست ۱۹۹۹ء کو کر دی کہ قدیمی مسجد کو گرا دیا جائے کیونکہ اس کی قدامت کے بارے میں کوئی تحریری شہادت پیش نہیں کی جا سکی اور نئے کمپلیکس کے اندر اس قدیمی مسجد کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اگرچہ ۶/اپریل ۱۹۹۸ء کو وزیراعظم پاکستان نے جس ترمیمی ڈیزائن اور تخمینہ جات کی منظوری دی تھی اس میں یہ قدیمی مسجد موجود تھی بلکہ یہ سفارشات بھی کی گئی تھیں کہ نئی مسجد کا ڈیزائن قدیمی مسجد کی نسبت سے تیار کیا ہے۔

۲۶) کنہیالال ہندی، 'تاریخ لاہور' (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء)، صفحہ ۳۳۵۔

۲۷) نور احمد چشتی، 'تحقیقاتِ چشتی' (لاہور: الفیصل، ۲۰۰۱ء)، صفحہ ۱۵۹۔

۲۸) محمد سلیم حماد ہجویری قادری، 'فاتح قلوب' (لاہور: ہجویری فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء)، صفحہ ۳۳۔

سبالٹرن اسٹڈیز ___ محکوموں کی تاریخ

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

سبالٹرن اسٹڈیز (Subaltern Studies) تاریخ نویسی کا ایک نسبتاً نیا اندازِ فکر اور ایک نیا مکتبۂ خیال ہے جو گزشتہ تقریباً ربع صدی سے تاریخ نویسوں میں اور بالخصوص ہندوستان کی تاریخ سے شغف رکھنے والے مؤرخوں میں خاصا مقبول نظر آتا ہے۔ 'سبالٹرن' فوج اور عسکری دنیا سے اخذ کردہ اصطلاح ہے جو فوج کے نچلے سپاہیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کو پہلے پہل سیاسی لٹریچر میں معروف اطالوی مفکّر انتونیو گرامچی (Antonio Gramci) نے استعمال کیا۔ گرامچی کی طرف سے اور پھر ہندوستانی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے مؤرخین کی جانب سے اس اصطلاح کو تاریخ نویسی کے باب میں استعمال کرنے کے پیچھے جو مقصد کارفرما تھا وہ ایک خاص تصور کو اُجاگر کرنا تھا۔ جس طرح فوج کے ادارے میں ایک عام سپاہی ایک خاص کردار کا حامل ہوتا ہے اسی طرح معاشرے کے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی نچلے منصبوں پر فائز اور بظاہر ادنیٰ کام کرنے والے لوگ پائے جاسکتے ہیں۔ انہی لوگوں کے لیے یہ عمومی اصطلاح یعنی 'سبالٹرن' اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فوج میں ایک عام سپاہی جو نچلے درجوں پر فائز ہوتا ہے، ایک ایسے ماتحت کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کام افسرانِ بالا کے احکام پر بلا چون و چرا عمل کرنا ہوتا ہے۔ فوج کا یہ معمولی سپاہی احکام کا بندہ ہوتا ہے اور حکامِ بالا کی تابعداری میں ہی اس کی زندگی کے دن بسر ہوتے ہیں۔ وہ ان احکام کی تعمیل کرتے کرتے بالآخر اپنی ملازمت کی مدت پوری کر لیتا ہے یا دورانِ ملازمت کسی جنگ میں یا کسی چھوٹے بڑے معرکے میں کام آجاتا ہے۔ سبالٹرن کی زندگی کی سب سے بڑی اخلاقی قدر احکام کی بجاآوری ہی ہوتی ہے۔ اس بجاآوری میں وہ خود کو جس قدر چابکدست اور مستعد ثابت کرتا ہے اتنا ہی اُس کو اچھا سپاہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک سبالٹرن سوال

نہیں کرسکتا، وہ اختلاف کے حق سے بھی محروم ہوتا ہے، اُس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی، نہ ہی اس کی اپنی کوئی حیثیت اور شناخت ہوتی ہے۔

لیکن ایک سبالٹرن کی زندگی کیا محض ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ وہ نظر آتی ہے۔ کیا یہی اُس کی اصل حقیقت ہے؟ کیا یہ زندگی، احکام کی بلاچون و چرا بجا آوری کا اُس کا روّیہ، ایسی جنگوں میں اس کا اپنی جان کا نذرانہ دے دینا جن جنگوں کے آغاز و انجام کے فیصلوں میں اُس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، کیا یہ سب کچھ خود اختیاری اور رضا کارانہ طور پر ہی ہوتا ہے یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک سبالٹرن کے حالات نے، اُس کی مجبوریوں اور اُس کی آس اور پیاس نے اُس کو ایک ایسی صورتِ حال اور ایک ایسے نظام میں جکڑ دیا ہو جس میں چند لوگ حکم دینے جبکہ دوسرے بیشتر لوگ اس حکم پر عمل درآمد کرنے پر مامور ہوں اور اگر سبالٹرن اپنی افتادِ طبع اور مرضی سے ہٹ کر ایک مختلف زندگی گزار رہا ہے تو پھر اس کی اصل زندگی کیا ہے اور اس کی حقیقی خواہشات اور اُس کے عقائد و تصورات کا صحیح مظہر کیا ہے۔ وہ کیا شواہد ہیں جو ہم ایک سبالٹرن کی زندگی کے آس پاس سے اکٹھے کر سکتے ہیں اور جن کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بے نام و بے چہرہ سپاہی اصل میں اُس روپ سے بہت مختلف ہے جس میں وہ نظر آتا ہے اور جو کچھ وہ نظر آتا ہے وہ اُس کی حقیقت نہیں ہے بلکہ اُس کی ضرورت و مجبوری کا شاخسانہ ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک عام فوجی سپاہی اور سبالٹرن کی اصل اور اُس کی حقیقی تصویر دیکھنی ہو تو ماضی کے اُن نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے جو بڑے بڑے سپہ سالاروں کی فوجوں نے اپنے پیچھے چھوڑ رکھے ہیں۔ درۂ خیبر سے گزرتے ہوئے اور یہاں اپنے پڑاؤ کے دوران تُرک، مغل اور دوسری افواج کے سپاہی سنگلاخ چٹانوں پر اپنے اُن رشتہ داروں اور دوستوں کے نام بڑی محنت سے کندہ کر دیا کرتے تھے جن کو وہ بہت پیچھے وطن میں چھوڑ آتے تھے مگر جن کی یادیں اُن کو ہر لمحہ بے چین رکھتی تھیں۔ یہ نقوش دیکھتے وقت آج ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے کتنے سپاہی اپنی مرضی کے خلاف اُن افواج میں بھرتی ہوئے ہوں گے جن کی فتوحات سے تاریخ کے صفحے اٹے پڑے ہیں، کتنے سپاہی ہوں گے جن کو ملک گیری اور کشت و خون سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی اور جن کے بس میں ہوتا تو ان سنگلاخ گھاٹیوں میں خوار ہونے کے بجائے وہ اپنے وطن کی مانوس فضاؤں میں اور اپنے چاہنے والوں کے درمیان وقت گزارتے مگر پیٹ کے دوزخ

نے ان کو جنگ گری کی آگ میں جھونک دیا ہوگا۔ ذرا پاس کی تاریخ کو دیکھیں اور ماضی قریب کی جنگوں کے حوالے سے بات کریں تو ایسی اور بھی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ جنگوں میں جھونکے گئے سپاہی ضروری نہیں کہ لازماً واقعی جنگ پسند بھی تھے۔ ویت نام میں ہلاک ہونے والے امریکی فوجیوں کی جیبوں سے نکلنے والی اُن کے بچوں کی یا محبوباؤں کی تصویریں ہوں یا عراق میں امریکی حکومت کے ایما پر لڑنے والے سپاہیوں کی طرف سے اپنے ماں باپ کو بھیجے گئے ای۔میل کے مضامین ہوں، یہ سب ہمیں یہی باور کراتے ہیں کہ ایک نچلے درجے کا بظاہر بے وقعت سپاہی اکثر اپنی مرضی کے خلاف اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے ایک مختلف راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ سو آج تاریخ نویسی کا ایک کارِ منصبی یہ بھی ہے کہ وہ اس ادنیٰ حیثیت کے مالک فرد کی اصل کو دریافت کرے اور یہ دکھانے کی بھی کوشش کرے کہ وہ کون سے حالات تھے جنھوں نے اس بندۂ خاکی کو تمام عمر ایک مشتِ خاک بنائے رکھا۔

سبالٹرن اسٹڈیز سے وابستہ تاریخ نویسوں کا مدعا یہ ہے کہ جس طرح فوج کے ادارے کے سب سے کم منصب سپاہی کی اصل اور پوشیدہ زندگی کو دریافت کرنا ایک دلچسپ اور معلومات افزا مشق ہوسکتی ہے، اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں نچلے منصبوں پر فائز اور کم تر حیثیت کے حامل لوگوں کی زندگیوں پر پڑے ہوئے اخفا کے پردے کو اُٹھا کر بھی ہم ان شعبوں کے بارے میں زیادہ بہتر اور مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ تب ماضی کی ایک زیادہ مکمل اور مستند تصویر بھی ہمارے سامنے آسکتی ہے۔

سبالٹرن مؤرخین نے جو مطالعے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف جمعیتوں کے حوالے سے کیے ہیں اُن میں ایک قدرِ مشترک ہر شعبۂ زندگی میں حاکم و محکوم کے نظام کی موجودگی ہے۔ ملوکیتوں میں بادشاہ، حاکم اور رعایا، محکوم تھی۔ فیوڈل معاشرے میں زمیندار، حاکم جبکہ کسان، محکوم تھا۔ سرمایہ دارانہ طرزِ پیداوار کے متعارف ہونے کے بعد حاکم و محکوم کی یہ دوئی سرمایہ دار اور محنت کش کی شکل میں سامنے آئی۔ اسی دوئی کو خاندانی نظام میں تلاش کیا جائے تو یہ پتا اور پترا کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خاندانی نظام میں یہ تضاد مرد اور عورت کا تضاد ہے اور ذات پات کے نظام میں اس کا اظہار اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں، اشراف اور اجلاف کی شکل میں ہوتا رہا ہے۔ یہ سب نظام، حاکمیت کے نظام تھے۔ گویا ان سب نظاموں میں حاکم و محکوم کا رشتہ موجود رہا ہے۔ سبالٹرن

مؤرخوں کا بہت بنیادی اعتراض یہ ہے کہ ہماری اب تک کی بیشتر تاریخ نویسی اعلیٰ طبقات، بادشاہوں اور ان کے دربار، مہم جُو فوجی سپہ سالاروں، سیاسی وقومی رہنماؤں یا ملک کے سیاسی ڈھانچے میں مرکزی سطح پر مصروفِ کار زعما وعمائدین کی سرگرمیوں تک محدود رہی ہے۔ اس تاریخ نویسی سے ماضی کے بارے میں کچھ کارآمد معلومات ضرور مل سکتی ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی یہ تاریخ نویسی محض اعلیٰ طبقات اور مقتدر افراد تک محدود ہونے کی بنا پر ایک یکطرفہ تاریخ نویسی ہے اور اسی وجہ سے یہ ماضی کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سبالٹرن تاریخ نویس، تاریخ کو محض حاکموں کے زاویے سے دیکھنے کے خلاف ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کو محکوموں کے زاویے سے بھی دیکھا جائے اور کیونکہ یہ محکوم، بالعموم زیرِ عتاب بھی رہے ہیں، لہٰذا ان کی تاریخ کو معتوبوں کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کیونکہ ان محکوم ومعتوب لوگوں نے تاریخ میں بارہا احتجاج کا مظاہرہ بھی کیا اور احتجاج کے نت نئے اسلوب اور راستے تلاش کیے اسی لیے ای۔ سریدھرن (E. Sreedharan) نے ان کی تاریخ کو بجا طور پر 'احتجاج کی تاریخ نویسی' (Historiography of Protest) قرار دیا ہے۔[1]

سبالٹرن مؤرخوں نے تاریخ کو کسی بلند و بالا مقام سے دیکھنے کے بجائے اُس کو سب سے نچلی سطحوں پر اور عام انسانوں کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں ایک عام آدمی جو اس سے پہلے تاریخی ادب میں نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اب تاریخ کی ایک اہم قوت بن کر سامنے آیا ہے۔ سبالٹرن مؤرخوں نے تاریخ کو نیچے سے دیکھنے اور دکھانے یا History from below کا جو اسلوب ایجاد کیا ہے اس کے نتیجے میں ہمیں اُن مجبور ومقہور لوگوں کو دریافت کرنے میں مدد ملی ہے جن کو پہلے یا تو یکسر خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا یا جن کے لیے ایک آدھ جملے پر اکتفا کرلیا جاتا تھا۔ مثلاً بادشاہوں کے دورِ حکومت کی مختلف تفصیلات پر مشتمل طویل ابواب میں کبھی کبھار ایک جملہ اس طرح کا بھی نظر آجاتا تھا کہ 'اُس کی رعایا بہت مطمئن تھی'۔ یا یہ کہ 'وہ رعایا میں بہت مقبول تھا'۔ یہ رعایا کیا تھی؟ اس میں کون کون شامل تھا؟ اس کے رسم ورواج کیا تھے؟ اس کی مجبوریاں کیا تھیں؟ یہ کب خوش اور کب ناخوش ہوتی تھی؟ یہ سب تفصیلات بادشاہوں کے قصّوں میں یا اُن پر لکھے گئے طویل ابواب میں جگہ نہیں پاتی تھیں۔ اب یہی رعایا تاریخ کے صفحات میں جگہ پارہی ہے۔

سبالٹرن تاریخ نویسی صرف کسی ایک دور یا عہد کے مطالعے تک محدود نہیں بلکہ اس نے ہر عہد کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ چنانچہ وہ عہدِ قدیم ہو یا عہدِ وسطیٰ یا جدید دور، ہمیں اب سب ادوار کے بارے میں بہت سے سبالٹرن مطالعے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ ان مطالعوں کے نتیجے میں ماضی کی تاریخ نویسی کے سقم اور اس کی کمزوریاں بہت نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ہیں۔ مثلاً جدید ہندوستان کے بارے میں کیے گئے سبالٹرن مطالعے نہ صرف استعماری تاریخ نویسی کو چیلنج کرتے ہیں جن میں یہ دکھایا جاتا تھا کہ ہندوستان انگریز کی آمد سے پہلے کتنا پسماندہ اور تہذیب نا آشنا تھا اور انگریز نے کس طرح یہاں تہذیب و تمدن کی آبیاری کی، بلکہ ان مطالعوں میں خود ہندوستان کی قومیتی تاریخ نویسی کے بعض بنیادی مفروضات کو بھی چیلنج کیا گیا ہے۔ مثلاً سبالٹرن مطالعے یہ واضح کرتے ہیں کہ ہندوستانی قومی تاریخ نویسی تمام و کمال اشراف پسند یا Elitist ہے۔ سبالٹرن مورخوں نے دیہات اور محلوں کی سطح سے اکٹھے کیے گئے حقائق اور اعداد و شمار کی مدد سے اس خام خیالی (Myth) کو توڑ ڈالا کہ یہ قومی تحریکیں چند افراد کی دین تھی جن کے افکار نے پورے معاشرے کو متحرک کر دیا، لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے عمل کے راستے پر ڈال دیا اور اُن کے اندر ایک ایسی روح پھونک دی جو آزادی سے کم کسی چیز سے آسودہ نہیں ہو سکتی تھی۔ سبالٹرن مؤرخین نے یہ ثابت کیا کہ یہ چند افراد یا زعماء کے گرد بُنی گئی تاریخ نویسی عوام کو فاعل کے بجائے ایک مفعول کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ وہ ایسے ہجوم کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں جن کو مناسب طور پر ہانکنے والے میسّر ہوں تو وہ بڑی سے بڑی منزلیں حاصل کر سکتے ہیں اور یہ رہنما میسر نہ ہوں تو عوام کا یہ ہجوم بے نیل و مرام رہے۔

سبالٹرن مؤرخین ہمیں بتاتے ہیں کہ قومی تحریکوں میں بھی عوام کا کردار بڑی اہمیت کا حامل تھا جنہوں نے بارہا قائدین کے فیصلوں سے ہٹ کر بھی اقدام کیا اور اُن کا یہ اقدام اُن کے مقامی حالات کے تناظر میں متشکل ہوا۔ ضروری نہیں کہ ایک عام آدمی قائدین کے اچھے یا بُرے فیصلوں کو اُسی رنگ میں دیکھتا ہو جس رنگ میں قائدین نے اِن فیصلوں کو پیش کرنا چاہا بلکہ عوام کا اِن کے حوالے سے ردِعمل اُن کے اپنے تناظر سے اور اپنے حالات سے متعین ہوتا رہا۔

سبالٹرن اسٹڈیز کے بانیوں میں سرِفہرست رانا جیت گوہا (Ranajit Guha) کا نام آتا ہے۔ اُن کو اس مدرسۂ فکر کا سب سے سربرآوردہ مؤرخ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ رانا جیت گوہا

ازراہِ انکسار کبھی بھی خود کو سبالٹرن اسٹڈیز کا بانی نہیں کہتے اور اُن کا کہنا ہے کہ یہ کئی ہم خیال نوجوان تاریخ نویسوں کی مشترکہ کاوش تھی جس نے سبالٹرن اسٹڈیز کی شکل اختیار کی، لیکن امرِ واقعہ یہی ہے کہ سبالٹرن اسٹڈیز کے پیچھے سب سے زیادہ جس شخص کی سوچ اور رہنمائی کارفرما تھی وہ گوہا ہی تھے۔ گوہا کی اپنی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے اور اس کا مختصر ذکر خود سبالٹرن اسٹڈیز کی شروعات اور اس کے پیچھے کارفرما سوالات کو سمجھنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔[۲] رانا جیت گوہا کا تعلق ہندوستان کی اُس نسل سے ہے جس نے آزادی کے آس پاس آنکھ کھولی اور آزادی کی تحریک کے زمانے کے اُبھار کی یادوں کے ساتھ اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن آزادی کے بعد یہ نسل جلد ہی غیر یقینی اور اضطراب کے گرداب میں پھنستی چلی گئی۔ آزادی کی تحریک کے دوران جس قسم کے خواب دیکھے گئے تھے، آزادی کے بعد اُن کی تعبیر نہیں مل سکی اور مایوسیوں نے اس نسل کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ گوہا کا کہنا ہے کہ آزادی کی تحریک کے زمانے میں لوگ یا دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے یا بائیں سے (خود گوہا کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے) لیکن دائیں کے ہوں یا بائیں کے، سیاسی کارکنوں کی بڑی اکثریت قومی تحریک کا حصہ تھی۔ اُس وقت قوم پرستی یا نیشنلزم کی اساس استعمار مخالفت یا سامراج دشمنی پر استوار ہوئی تھی۔ لہٰذا قومی تحریک سے وابستہ لوگوں نے بھی اس سے آگے کچھ زیادہ سوچ بچار نہیں کی تھی۔ اُن کا واحد ہدف سامراج کو ہندوستان سے نکالنا تھا مگر آزادی کے بعد کیا کیا جانا تھا یا دوررس معنوں میں آزادی کا مفہوم کیا تھا، اِن اُمور پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ گوہا کہتے ہیں کہ آزادی کے چند برس بعد جب مایوسی کی فضا عام ہوئی تو دانشورانہ سطح پر میرے ذہن میں بھی بعض سوالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یہ سوالات ماضی کے حوالے سے تھے، یہ قومی آزادی کی تحریک کے بارے میں بھی تھے اور خود قومیتی تصورات کی بابت بھی۔

رانا جیت گوہا جن کا تعلق بنگال سے ہے، سیاسی سرگرمیوں سے نکل کر علمی دنیا میں آئے مگر یہاں انہوں نے ابتدائی طور پر اقتصادیات کو اپنا مضمون بنایا۔ اُن کا ابتدائی علمی اور تحقیقی کام بھی اقتصادیات ہی کے مضمون میں تھا جس کا ایک بڑا سبب اُن کا بائیں بازو سے تعلق تھا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ امریکہ بھی گئے جہاں انہوں نے اقتصادی مؤرخ کی حیثیت سے کچھ کام کیا۔ وہ مشہور تحقیقی مجلّے 'انڈین اکنامک ہسٹری ریویو' کے بورڈ میں بھی شامل رہے۔ ۱۹۶۳ میں وہ واپس ہندوستان آئے لیکن اب وہ اقتصادی تاریخ نویسی سے کافی حد تک اُکتا چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا

کہ ہندوستان میں اقتصادی تاریخ نویسی کا اب یہ چلن بن چکا تھا کہ مؤرخ چند لوگوں سے ملتے تھے، اعداد و شمار اکٹھے کرتے تھے اور اُن کو مربوط انداز میں پیش کرتے ہوئے اپنے مقالے تیار کرلیا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک میکانکی انداز میں تاریخ کو بیان کر دینا خاصی سادہ لوحی کی بات تھی۔ گوہا، نسبتاً زیادہ پیچیدہ راستے پر جانا چاہتے تھے۔ اُن کا میلان اب دانشورانہ تاریخ یا intellectual history کی طرف ہو چکا تھا۔ گوہا کا یہ بھی خیال تھا کہ اقتصادی تاریخ نتیجہ خیز اور بامعنی بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اقتصادی مؤرخ اپنے میدان کا خاطر خواہ تجربہ رکھتا ہو اور اُس میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ اعداد و شمار کا اسیر بن جانے کے بجائے ایک مضبوط اقتصادی فلسفیانہ نظریہ وضع کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسا ہو سکے تو اعداد و شمار تاریخ نویس کے کام کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ تاریخ نویس کو ہانکنے کا کام کریں۔ مگر ان کے خیال میں ماضی میں ہندوستان میں یہی ہوا تھا۔ اقتصادی مؤرخوں نے خود کو محدود اقتصادی دائرے میں ہی محصور رکھا۔ گوہا، بقول خود، اقتصادی مؤرخوں کے 'کاروباری مکالموں' (trade dialogue) سے مکمل طور پر بدظن ہو چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نری اقتصادیات کے بجائے کثیر الموضوعی علم کے جویا بن چکے تھے۔ ۵۰ء اور ۶۰ء کے عشروں کے اور بھی کئی ماہرینِ اقتصادیات نے بعد کے برسوں میں اپنی علمی بنیادوں کو وسعت دی اور دوسرے علوم سے اپنے اقتصادی علم کو ہم آہنگ کیا۔ مثلاً معروف ماہرِ اقتصادیات امرتیا سین (Amartya Sen) نے فلسفے سے تعلق قائم کیا۔ اسی طرح رانا جیت گوہا علم الانسان (Anthropology) اور تہذیبی مطالعوں (cultural studies) کی طرف گئے۔ انہوں نے ادبیات کا بھی عمیق مطالعہ کیا جس کے مظاہر اور نتائج ہمیں اُن کے سبالٹرن مطالعوں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ادب اور تخلیقی رجحانات سے اُن کو اس درجہ رغبت ہے کہ اُن کے بعض ناقدین کو یہ اعتراض ہے کہ اُن کا کام کچھ زیادہ ہی 'ادبی' ہو چکا ہے، وہ متن کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور زبان کے عامل کا مطالعہ اُن کی تحقیقی تشریحات میں بڑا مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

رانا جیت گوہا ۱۹۶۰ء کے عشرے میں محدود اقتصادی تاریخ نویسی سے ہی منحرف نہیں ہوئے بلکہ اس زمانے میں ہندوستانی قومیت کے بارے میں بھی بعض بنیادی سوالات اُن کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ انہی سوالات کے جواب تلاش کرنے کے عمل میں اُن کی آئندہ کی فکری

سمت متعین ہوتی چلی گئی اور اُن کے ذہن میں سبالٹرن اسٹڈیز کا خاکہ مرتب ہوتا چلا گیا۔

سب سے اہم سوال جو گوہا کے ذہن میں پیدا ہوا وہ گاندھی اور ہندوستان کی قومی تحریک کے تعلق کے بارے میں تھا۔ گوہا نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک گاندھی پر کام کیا تھا۔ وہ گاندھی پر ایک بھرپور کام کرنا چاہتے تھے جس کے لیے انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مواد بہم کیا۔ انہوں نے خاص طور سے گجرات کے آرکائیوز میں خاصا وقت تحقیق کی نذر کیا۔ ۱۹۷۰ء تک وہ اس لائق ہو چکے تھے کہ گاندھی پر کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک پبلشر سے بات چیت بھی ہوگئی مگر یہ کتاب کبھی لکھی نہیں گئی۔

گاندھی کے موضوع پر ایک طویل عرصہ تحقیق کا حاصل ایک سوال تھا اور شاید اسی سوال نے انہیں گاندھی کی سوانح کے منصوبے کو ترک کرنے پر بھی مجبور کیا ہو۔ وہ سوال یہ تھا کہ گاندھی نے جن تصورات کی علمبرداری کی اور جن نظریوں کو اپنی سیاست کی اساس بنایا وہ تصورات و نظریات اُس قومی تحریک میں جاگزیں کیوں نہ ہو سکے جس تحریک کی گاندھی قیادت کر رہے تھے۔ مثلاً کانگریس کی چلائی ہوئی تحریکوں میں، بلکہ یہاں تک کہ خود گاندھی کی قیادت میں چلنے والی تحریکوں میں بھی بالآخر لوگوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا جبکہ گاندھی عدم تشدد کے علمبردار اور اہنسا کے بہت بڑے پیامبر تھے۔ گوہا نے یہ دیکھا کہ قومی اور علاقائی سطح پر پیدا ہونے والا ہر عوامی اور سیاسی تحرّک (mobilization) بالآخر تشدد پر ختم ہوا۔ یہاں تک کہ ہر دفعہ کانگریس اور گاندھی کو خود ہی اس تحرّک کو ختم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چوری چورا کا واقعہ اس کی ایک مثال تھا۔ ایسا ہی انجام عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکوں کا ہوا۔

رانا جیت گوہا ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۱ء میں برطانیہ کی سسیکس یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے۔ وہ اپنے سوالات وہاں اپنے ساتھ لے کر گئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ہندوستان میں نکسل باڑی تحریک ناکامی کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی بلکہ خود تحریک کے رہنما چارو مجمدار نے پسپائی کے عمل کی رہنمائی کی، وہ پکڑا گیا اور پھر مارا گیا۔ اس واقعے سے گوہا کو پھر ایک سوال میسر آیا جو اُن کے گاندھی کے حوالے سے درپیش سوال سے ملتا جلتا تھا۔ گوہا نے سوچا کہ اگر یہ نکسل تحریک اتنی ہی ناقص تھی اور اُس کے پاس کوئی باقاعدہ نظریہ بھی نہیں تھا تو پھر اس نے پورے ملک کے نوجوانوں کو کس طرح متحرک کر دیا تھا۔ گاندھی اور نکسل تحریک دونوں نے بنیادی طور پر دیہی علاقوں میں

اپنے اثرات پیدا کیے تھے اور ان تحریکوں میں متحرک ہونے والے لوگ بنیادی طور سے کسان ہی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں تحریکیں اپنے مبینہ طریقہ ہائے کار میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ نکسل تحریک تشدد پر مائل تھی جبکہ گاندھی عدم تشدد کے مدعی تھے۔ گاندھی اور نکسل تحریک میں ایک قدرِ مشترک بھی تھی اور وہ تھی ان دونوں کی ناکامی۔ گاندھی نے عدم تشدد کا نعرہ دیا جبکہ اُن کے پیروکار تشدد کی طرف راغب ہوئے، دوسری طرف نکسل باڑی تحریک نے تشدد کا راستہ اختیار کیا مگر وہ اپنے اہداف کے حصول میں ناکام رہی۔ گوہا نے اس تضاد سے یہ سوال اخذ کیا کہ کسانوں کی طرف سے تشدد کا راستہ کیوں اختیار کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اُن کے مقاصد کب حل ہوتے ہیں اور کب نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسانوں کی تحریکوں کے مطالعے کی سمت میں بڑھنا شروع ہوئے۔ انہوں نے گاندھی پر اپنے کام کو ایک طرف رکھا اور کسان تحریکوں اور بغاوتوں کو سمجھنے میں مشغول ہوگئے۔ یہاں انہوں نے سماجی بشریات (Social Anthropology) سے خوب مدد لی۔ انہوں نے مختلف معاشروں اور خاص طور سے ہندوستان کے حوالے سے تشدد کے واقعات کا ریکارڈ جمع کرنا شروع کیا۔ انہوں نے کتابوں سے، دستاویزات میں سے اور ہم عصر مآخذ سے تشدد آمیز واقعات کی جس قدر تفصیلات میسر ہوسکتی تھیں اُن کو جمع کیا اور یوں کئی ہزار واقعات کو سامنے رکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کدوکاوش کے نتیجے میں وہ یہ عمومی نتیجہ (generalization) یا نظریہ (theory) وضع کرنے میں کامیاب ہوئے کہ کسانوں کا تشدد نتیجہ ہوتا ہے اُس ذلت اور بے عزتی کی کیفیت کا جس میں کہ اُن کی اکثریت صدیوں سے مبتلا چلی آرہی ہے۔ جب ایک کسان، زمیندار کے صحن سے چھتری تانے گزرتا ہے تو زمیندار اس کو اپنی بے عزتی تصور کرتا ہے جس کی سزا کسی بھی شکل میں نکل سکتی ہے۔ یہ سزا کسان کے لیے زندگی بھر کا بوجھ بن جاتی ہے اور وہ اس کی تلافی کے لیے وقت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ یہ وقت اُسے جب بھی مل جائے وہ قرض اُتارنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اپنی تحقیق سے گوہا یہ سمجھنے میں کامیاب ہوگئے کہ بے عزتی کس طرح تشدد میں ڈھلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خود بے عزتی بھی ایک طرح کا تشدد ہے جو اپنے ردِعمل کے طور پر تشدد ہی کو جنم دیتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ سیاسی حرکت پذیری (mobilization) صدیوں سے ذلت کے زخم سہنے والے لوگوں کو اس بوجھ کو اپنے سر سے اُتارنے کا موقع فراہم کردیتی ہے اور لوگ حکمرانی کے موجود ضابطوں (code of

(authority کو توڑ کر خود کو ذہنی طور پر آزاد محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو گاندھی جیسے رہنما بھی اگر عدم تشدد کا درس دیتے رہیں تو وہ اُن کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی کا اہنسا کا تصور ہندوستان میں تشدد آمیز واقعات کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہا حالانکہ گاندھی قومی آزادی کی تحریک کے بہت بڑے رہنما تھے۔ رانا جیت گوہا نے ہندوستان کے بارے میں یہ طے کیا کہ یہ صرف 'اہنسا' کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ 'ہنسا' کی نمائندگی بھی کرتا ہے یعنی صرف عدم تشدد ہی نہیں بلکہ تشدد بھی ہندوستانی کلچر کا حصہ ہے اور اس کے اسباب ناقابلِ فہم نہیں ہیں۔ اپنے ایک مقالے میں رانا جیت گوہا نے دیہی معاشرت کے اس تحکم پر مبنی نظام کو ہندوستانی ادبیات اور مذہبی ونظریاتی روایت میں بھی تلاش کیا۔ اُن کے، دھرم شاستروں کے مطالعے نے اُن پر یہ بات واضح کی کہ تحکم اور بالادستی کا یہ نظام خود شاستروں میں بھی موجود تھا جن کی رُو سے پتا اور پُترا، گورو اور ششیا، راجا اور پراجا اور زمیندار اور رعیت کے رشتے حاکم ومحکوم کے رشتے ہیں اور ان رشتوں میں تحقیر کا عنصر بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔[۳]

رانا جیت گوہا کے حوالے سے نسبتاً طویل گفتگو کرنے سے ہمارا مقصد سبالٹرن اسٹڈیز کے ایک مرکزی تاریخ نویس کے اس رجحان کی طرف مائل ہونے کا پس منظر واضح کرنا تھا۔ سبالٹرن اسٹڈیز کے سلسلے میں اب تک آٹھ، دس مجموعہ ہائے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے ہر مجموعے میں سات، آٹھ مقالات شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح سے سبالٹرن اسٹڈیز اب تک ایک وقیع سرمایۂ علم بہم کر چکا ہے۔ ان مطالعوں میں سے چند ایک کا ذکر سبالٹرن اسٹڈیز کے دائرۂ کار اور اُس کے تحت ہونے والے اُچھوتے مطالعوں کی معنویت کو واضح کرنے کے لیے مددگار ہو سکتا ہے۔

سبالٹرن مصنفین میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر شاہد امین بھی شامل ہیں۔ انہوں نے جن موضوعات پر کام کیا ہے اُن میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مشرقی یوپی کے کسانوں کی حالتِ زار،[۴] چوری چورا کے واقعے پر عدلیہ کے کردار[۵] اور گورکھپور ڈسٹرکٹ میں ۱۹۲۱ء-۱۹۲۲ء میں گاندھی کی آمد اور مقبولیت[۶] کا تجزیہ جیسے دلچسپ موضوعات شامل ہیں۔ شاہد امین ان سب مطالعوں میں بعض نئے اور پرانے ماخذ کی مدد سے بہت دلچسپ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ گاندھی پر اُن کا مقالہ ہندوستان کی قومی تحریک

کے ایک اہم زاویے یعنی اس میں مقامی لیڈر شپ کی طرف سے لوگوں کو متحرک کرنے کے موضوع پر بحث کرتا ہے۔ گاندھی نے مشرقی یوپی میں گورکھپور کے ضلع کا ۸ فروری ۱۹۲۱ء کو دورہ کیا اور وہاں ایک سے ڈھائی لاکھ افراد کے مجمع سے خطاب کر کے وہ اُسی شام بنارس چلے گئے۔ شاہد امین اس دورے کی تفصیلات لکھتے ہیں اور ہمعصر ماخذ کی مدد سے یہ دکھاتے ہیں کہ مقامی کسانوں میں گاندھی کے لیے کس قدر عقیدت پائی جاتی تھی جو دور دراز علاقوں سے اُن کا درشن کرنے کے لیے آئے تھے۔ شاہد امین کہتے ہیں کہ ہندوستان کے قومیتی تاریخ نویس عام لوگوں کو محض گاندھی کا عقیدت منداور اُن کے درشن کرنے والا گروہ بنا کر پیش کرتے ہیں جبکہ قومی تحریک کو منظّم کرنے کا کام شہری پڑھے لکھے طبقے اور پارٹی کے کارکنوں کی کوششوں کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ گویا مہاتما اور عوام کے بیچ میں ایک سیاسی واسطے کا یہ کام اُن پیروکاروں نے سرانجام دیا جو معاشی لحاظ سے زیادہ خوشحال اور سماجی اعتبار سے زیادہ طاقتور تھے۔ دوسرے لفظوں میں مہاتما کا مقام بڑی حد تک اشرافیہ کی کارکردگی کا مرہونِ منت تھا۔ شاہد امین کا کہنا ہے کہ مقامی آبادی کا گاندھی کے بارے میں ایک عقیدت کا تعلق ضرور تھا اور گاندھی کو ان لوگوں میں ایک دیومالائی کردار کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی مگر عملاً گاندھی کی، ان لوگوں کے اقدامات پر گرفت کی طاقت بہت زیادہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ براہِ راست طور پر ان لوگوں کے عمل اور ردِعمل کو متعین کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ کسانوں کے عملی اقدامات کی بنیاد صحیح اور غلط، جائز و ناجائز اور منصفانہ و نامنصفانہ کے بارے میں اُن کے اپنے تصورات پر قائم تھی۔ تاہم وہ یہ اقدامات کرتے وقت جو یہ 'مہاتما گاندھی کی جے' کا نعرہ لگاتے تھے تو گویا اس احساس کی نمائندگی کرتے تھے کہ کیونکہ گاندھی بھی انصاف کی بات کرتے ہیں لہٰذا وہ جو کچھ کر رہے ہیں اُس کو گاندھی کی تائید حاصل ہوگی۔ بعض اوقات اُن کے یہ اندازے بالکل غلط بھی ہو سکتے تھے اور اُن کی خواہشات اور اقدامات گاندھی اور کانگریس کی مقامی قیادت کی سوچ سے بہت مختلف بھی ہو سکتی تھی۔ شاہد امین کا کہنا ہے کہ چوری چورا کا واقعہ اسی تضاد کا نتیجہ تھا جس میں مقامی لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ گاندھی کی سوچ کے مطابق ہے، ایک ایسے راستے کا انتخاب کیا جو دراصل گاندھی کے طرزِ فکر سے بہت ہٹ کر تھا۔ شاہد امین کا یہ مطالعہ قومی آزادی کی تحریک میں قیادت اور عوام کے تصورات کے درمیان فاصلے کو اُجاگر کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ قومی تاریخ نویسی کے ایک یکطرفہ اور سپاٹ بیانیے کی نفی بھی کرتا ہے۔

سبالٹرن تاریخ نویسوں میں گیان پانڈے (Gyan Pandey) کا کام بھی بہت قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء کے زمانے میں اودھ میں جو کسان بغاوتیں ہوئیں انہوں نے اُن کا بھی تجزیہ کیا۔[۷] ڈیوڈ آرنلڈ (David Arnold) نے قحطوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور خاص طور سے آندھرا (۱۸۳۹ء۔۱۹۲۴ء) اور مدراس (۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء) کے قحطوں کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔[۸] ان کا ایک مقالہ ہندوستان میں طاعون کے موضوع پر ہے۔[۹]

دیپش چکرابرتی (Dipesh Chakrabarty) نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان کلکتہ کے پٹ سن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اپنی ایک تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔[۱۰] بنگال میں اور خاص طور سے کلکتہ میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے عشروں میں پٹ سن کے کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے حالات بہت شدت سے اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ خود کو منظم کریں اور محنت کشوں کی تنظیمیں اُن کے حالات کی بہتری کے لیے آواز بلند کریں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا اور محنت کش بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود، اور باوجود اس حقیقت کے کہ اُن میں بے چینی بھی موجود تھی جو اکثر اشتعال کی حد تک چلی جاتی تھی، منظم ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی بنیاد نہیں رکھ سکے۔ چکرابرتی کہتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء میں بنگال کے لیبر کمشنر کی رائے یہ تھی کہ دنیا میں کہیں بھی محنت کشوں کی تنظیم سازی کے نقطۂ نظر سے اتنی سازگار صورتِ حال موجود نہیں تھی جتنی کہ کلکتہ میں تھی جہاں شہر کے شمال اور جنوب میں صرف ۲۰ میل کے علاقے میں اتنی بڑی تعداد میں پٹ سن کے کارخانے موجود تھے جن میں مجموعی طور سے تین لاکھ افراد کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود یہاں پر منظم ٹریڈ یونین کی عدم موجودگی ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ چکرابرتی کے مطابق ۱۹۴۵ء کی ایک سرکاری انکوائری رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ جوٹ کے کارخانوں میں کام کرنے والے ۲ لاکھ ۶۷ ہزار کے قریب محنت کشوں میں سے صرف ساڑھے ۴۷ ہزار محنت کش کسی یونین کے ممبر تھے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے اعداد و شمار دینے کے بعد چکرابرتی یہ بحث کرتے ہیں کہ بنگال میں جوٹ ملز یا پٹ سن کے کارخانوں میں ٹریڈ یونین منظم کیوں نہ ہو سکی۔ وہ اس کا بنیادی سبب اُس علاقے کے سماجی دروبست میں ڈھونڈتے ہیں اور مقامی کلچر کے اندر حفظِ مراتب کے نظام (heirarchy) کو بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ مراتب کا یہ نظام، علاقے میں موجود فیوڈلزم کی دین تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ محنت کشوں کا کلچر بعض صورتوں

میں اُن کی آئیڈیالوجی کی راہ میں مزاحم ہوسکتا ہے۔

ایک اور سبالٹرن مطالعہ ۱۹۰۵ء کی تقسیمِ بنگال کے موضوع پر سومیت سرکار (Sumit Sarkar) نے کیا ہے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ تقسیمِ بنگال کے خلاف جو احتجاجی تحریک اُٹھی اُس میں عوامی شمولیت تحریکِ خلافت کی عوامی شمولیت سے بہت کم تھی۔ انہوں نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تقسیمِ بنگال کے خلاف تحریک میں ہندو اشرافیہ زیادہ متحرک تھی جبکہ تحریکِ خلافت نے عام لوگوں کو جن میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے، متحرک کر دیا تھا اور یہ اس تحریک کا عوامی پہلو ہی تھا جس کے پیشِ نظر خود خلافت تحریک کی قیادت کی جانب سے اس کو ختم کر دیا گیا۔[11]

پچھلے صفحات میں سبالٹرن اسٹڈیز کے تعارف اور چند سبالٹرن مطالعوں کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے اُس سے تاریخ نویسی کی اس نئی شاخ کے بارے میں تھوڑا بہت تعارف حاصل ہوسکتا ہے۔ اس گفتگو سے سبالٹرن اسٹڈیز کی چند خوبیاں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً:

۱) سبالٹرن تاریخ نویسوں نے معاشرے کے نچلے طبقات اور دور دراز علاقوں میں پائے جانے والے رجحانات کو زیرِ بحث لا کر تاریخ کے کینوس کو کہیں زیادہ وسیع کر دیا ہے۔

۲) ایسے علاقے جو پہلے بہت دور افتادہ یا remote سمجھے جاتے تھے اور وہ لوگ جو پہلے محض تاریخ کے حاشیے پر (marginalized) نظر آتے تھے، اب تاریخ کے مرکزی دھارے میں داخل ہو گئے ہیں۔

۳) سبالٹرن اسٹڈیز کی ایک کامیابی یہ ہے کہ اس نے نت نئے موضوعات تک پہنچ حاصل کی ہے اور ان موضوعات کے اوپر اعلیٰ تحقیق کے ذریعے ایسا مواد اکٹھا کیا ہے جو نئی نظریہ سازی کے کام آ رہا ہے۔

۴) سبالٹرن اسٹڈیز کی ایک اور کامیابی تاریخ کو حکمرانوں اور سرکردہ افراد کی قلم رو سے نکال کر ایک عام آدمی تک پہنچانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سبالٹرن اسٹڈیز نے فرد کو تاریخ کی نظروں میں زندہ کر دیا ہے اور اب تاریخ اُس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔

۵) سبالٹرن اسٹڈیز نے ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کا زیادہ معروضی تجزیہ کیا ہے اور اس میں موجود اُس رومانس کو جو کرشمہ ساز شخصیتوں کے گرد بُنا جاتا تھا، تحلیل کر دیا ہے اور اب اس تحریک کے لیڈر ہمیں اپنی اصل قامت کے ساتھ کھڑے نظر آتے

ہیں۔

۶) سبالٹرن اسٹڈیز کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ کیونکہ اس کا موضوع چھوٹے چھوٹے علاقے، چھوٹی چھوٹی بستیاں اور ایسے عام افراد ہیں جن کو اس سے پہلے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا، لہٰذا اُن کے بارے میں تحقیق کرنے کی خاطر مؤرخوں کو جو مواد اکٹھا کرنا پڑا اور تحقیق کے جو طریقے اختیار کرنا پڑے وہ بھی فنِ تاریخ نویسی کے فروغ اور اُس کی ترقی کے نقطۂ نظر سے کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں۔

جہاں سبالٹرن اسٹڈیز نے تاریخ نویسی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ہندوستان کے تاریخی مواد کو وقیع بنایا ہے وہیں اس کے بعض پہلو تنقید کا موضوع بھی بن سکتے ہیں۔ مثلاً سبالٹرن اسٹڈیز مختلف اجزا کے بارے میں علیحدہ علیحدہ تحقیق کرنے کی مشقت تو کرتی ہے مگر ان اجزا سے کوئی مربوط تصویر اُجاگر کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ لہٰذا اس کا ایک مطالعہ اس کے دوسرے مطالعے سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر اس کی نظری بنیادوں کو مضبوط نہیں ہونے دیتا۔ تاریخ نویسی یا کسی اور علم سے متعلق نظریات اُس وقت ہمارے لیے زیادہ کارآمد بنتے ہیں جبکہ اُن کی ایک مستقل اور پائیدار حیثیت ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے جب یہ نظریات باہم متناقص عناصر کے مجموعے کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں کوئی سبالٹرن مصنف اب تک کے تمام مطالعوں کو سامنے رکھ کر ایک بڑا علمی نظریہ وضع کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ سبالٹرن اسٹڈیز کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے بہت کارآمد ہوگا۔

حوالہ جات

1. E. Sreedharan, *A Textbook of Historiography 500 BC to AD 2000* (Hyderabad, India: Orient Longman, 2000).

۲) رانا جیت گوہا سے متعلق آئندہ سطور میں جو معلومات درج ہیں وہ ان مآخذ سے حاصل کی گئی ہیں:

(a) Shahid Amin and Gautam Bhadra, 'Ranajit Guha: A Biographical Sketch', in David Arnold and David

Hardiman (eds.), *Subaltern Studies VIII* (Delhi: Oxford University Press, 1997), pp.222-25.

(b) 'Writing History' [Interview of Ranajit Guha to Badri Narayan], *Biblio,* November-December 2003.

3. Ranajit Guha, *'Elementary Aspects of Peasant Insurgency in India* (Delhi: Oxford University Press, 1983).

4. Shahid Amin, 'Small Peasant Commodity Production and Rural Indebtedness: The Culture of Sugarcane in Eastern UP, c.1880-1920', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-1* (Delhi: Oxford University Press, 1997).

5. See, Shahid Amin, 'Approver's Testimony, Judicial Discourse. The Case of Chouri Choura', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies V* (Delhi: Oxford University Press, 1987).

6. Shahid Amin, 'Gandhi as Mahatma: Gorakhpur District, Eastern UP, 1921-22', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-III* (Delhi: Oxford University Press, 1984).

7. Gyan Pandey, 'Peasant Revolt and Indian Nationalism: The Peasant Movement in Awadh, 1919-1922', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-1, op.cit.*

8. David Arnold, 'Famine in Peasant Consciousness and Peasant Action: Madras, 1876-78', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-III, op.cit.*

9. David Arnold, 'Touching the Body: Perspectives on the Indian Plague, 1896-1900', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-V, op.cit.*

10. Dipesh Chakrabarty, 'Trade Unions in a Hierarchical

Culture: The Jute Workers of Calcutta, 1920-50', in Ranajit Guha (ed.), *Subaltern Studies-III, op.cit.*

11. Sumit Sarkar, 'The Conditions and Nature of Subaltern Militancy: Bengal from Swadeshi to Non-cooperation, c.1905-22', in Ranajit Guha (ed.), *ibid.*

ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد میں تاریخ نویسی

ہما غفار

عموماً ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کا تعین ۱۷۵۷ء تا ۱۹۴۷ء کیا جاتا ہے۔ تاریخ نویسی کی سرگرمیوں کے حوالے سے اگرچہ اس دور میں انگریزوں کے علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے بھی تاریخ نگاری میں دلچسپی لی تاہم اس مقالہ میں ہم نے اپنے آپ کو صرف انگریز منتظمین کی تاریخ نویسی کے جائزہ تک محدود رکھا ہے اور ان رجحانات و مقاصد کو جاننا چاہا ہے جو ان کی تاریخ نویسی میں جھلکتے ہیں۔ دراصل اس پورے دور میں نظریات و مقاصد کی مختلف جہتیں تاریخی ادب میں نظر آتی ہیں اور اسے صرف سامراجی اور غیر سامراجی کے دائرے میں مقید کر دینا مناسب نہیں ہوگا تاہم مغرب کی برتری اور سامراجی نقطہ نظر حاوی رجحان ضرور رہا۔ اپنے قیام و اقتدار کے ابتدائی دور میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں استحکام و توسیع کے مرحلے سے گزر رہی تھی اس وقت برطانوی منتظمین مقامی آبادی سے بہتر سماجی روابط استوار کیے ہوئے تھے۔ اور یہاں کی مذہبی، سیاسی، ثقافتی و سماجی تاریخ جاننے میں دلچسپی رکھتے تھے جس میں ماضی خصوصاً مشرق کی تاریخ سے رومانوی دلچسپی کے علاوہ انتظامی ضروریات کو بھی دخل تھا۔ جوں جوں برطانوی قوت و اقتدار مستحکم ہوتا گیا حاکم و محکوم قوم کا تعلق اور مغرب کا مشرق پر برتری کا رجحان غالب ہونے لگا۔ جس میں برطانیہ و مغرب میں فروغ پانے والے نئے نظریات نے مہمیز کا کام دیا۔ ان میں انجیلی دبستان (Anglicist School) نمایاں ہے جس کے یہاں لبرل اور افادیت پسند (Utilitarian) نظریات حاوی تھے۔ اس کے علاوہ انگلیلی عقائد (Evangelical) برطانوی استعماریت اور عیسائی مذہبی برتری کے نظریہ کو فروغ دے رہا تھا۔ ان رجحانات کے فروغ کے باوجود اس دور میں کہیں کہیں رومانوی تحریک بھی سر اُٹھا رہی تھی جس کے حامل مورخین کو نئے

مستشرقین کہا جاسکتا ہے۔ ان نظریاتی رجحانات کے علاوہ برطانوی منتظمین کا ایک حلقہ اپنے قابض علاقوں کی تاریخ سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اپنی سرگرمیوں اور کامیابیوں سے بھی۔

برطانوی سامراجیت کے ابتدائی دور میں برطانوی منتظمین نے ہندوستان کی تاریخ میں دلچسپی کا اظہار اپنے منشیوں سے فارسی میں برصغیر کی تاریخ پر کتابیں لکھوا کر کیا جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر جوناتھن اسکاٹ (Jonathan Scott) کی ہدایت پر مرتضیٰ حسین بلگرامی نے حدیقۃ الاقالیم لکھی، جنرل کرک پیٹرک (General Kirk Patrick) کی ایما پر شیو پرشاد نے روہیلکھنڈ کے افغانوں پر تاریخ فیض بخشی، ہنری وینسٹارٹ (Henry Vensittart) کے کہنے پر سلیم اللہ نے تاریخ بنگال اور غلام حسین طباطبائی نے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کی ہدایت پر سیر المتاخرین تحریر کی جس میں برصغیر کی قدیم تاریخ سے لے کر ۱۷۸۶ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسے مغلوں کے عہد زوال کی مکمل تاریخ[1] اور سائنسی طریقہ تاریخ نویسی کی موجودگی[2] کی وجہ سے اس وقت کے تاریخی ادب میں نمایاں اہمیت دی جاتی ہے۔ برطانوی منتظمین کے ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں اولین نام رابرٹ اورمی (Robert Orme) کا لیا جاتا ہے۔ اسے ۱۷۶۹ء میں ہندوستان سے واپس برطانیہ جانے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا باقاعدہ مورخ مقرر کیا گیا اس عہدہ پر وہ اپنی وفات (۱۸۰۱ء) تک موجود رہا۔ اس نے ہندوستان میں انگریزوں کی سرگرمیوں پر دو کتابیں تحریر کیں جن میں تین جلدوں پر مشتمل *A History of the Military Transactions of the British Nation in Indostan* (1763-1781) اور *Historical Fragments of the Mugal Empire of the Maratoes of the English Concern in Indostan from 1659* ہیں۔

اٹھارویں صدی میں یورپ میں رومانیت پسند تحریک ابھری جس نے عہد روشن خیالی (Enlightenment) کی عقلیت پسندی کے مقابلہ پر ایمان و احساسات، تخیلات و پراسراریت، جذبات و رومانیت پر زور دیا۔[3] تاریخ نویسی پر اس کا اثر قدیم اور پراسرار محسوس ہونے والی تہذیبوں میں دلچسپی، ان کے مذہبی و تہذیبی طور طریقوں اور تاریخ سے ہمدردانہ لگاؤ کی

صورت میں سامنے آیا۔ غالباً یہ رجحان ہندوستان میں موجود برطانوی منتظمین جو تاریخ لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے پر بھی اثر انداز ہوا اور یہ بھی کہ اس دور میں برطانوی منتظمین اپنے آپ کو کچھ حد تک مقامی تہذیب وثقافت میں ڈھالے ہوئے تھے اور یہاں کے بارے میں جاننا بھی چاہتے تھے۔ ان کے یہاں ہندوستان کی تاریخی قدامت، مذہب اور تہذیب وثقافت سے ایک رومانوی لگاؤ تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی زبان وادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور مذہبی عقائد، روایات، ذات وطبقوں اور قوانین کے مطالعے کی طرف بھی توجہ دی۔ مستشرقین کے اس حلقہ کے لیے ہندوستان سے دلچسپی کی بنا پر 'انڈولوجسٹ' (Indologist) کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی انہوں نے ہندوستان کی تاریخ، مذہب، تہذیب وادب کی سرپرستی کی اور اس پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اور ان کے یہاں ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور ادب کو سراہنے کا رجحان رہا اور انہوں نے یہاں تک کہا کہ ہندوستانی طریق زندگی ہندوستانیوں کے لیے اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا برطانویوں کے لیے برطانوی طریق زندگی[۴] اس رومانوی لگاؤ کے ساتھ یہ حلقہ ملکی امور، نظم مملکت، رسوم ورواج اور طور طریقوں میں مداخلت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ملک میں امن وامان کی ناقص صورتحال کا لامحالہ اثر تجارت کے فروغ پر پڑتا اور یہ چیز ایسٹ انڈیا کمپنی کو مقصود نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کو برطانیہ میں ٹوری پارٹی کے دائیں بازو کی حمایت حاصل رہی۔[۵]

برصغیر میں اولین طور پر متذکرہ رجحان کے حامی حلقہ کو ہندوستان کے گورنر جرنل وارن ہیسٹنگز کی حمایت حاصل رہی۔ جو کہ فارسی زبان کا ماہر اور ہندوستان کے زبان وادب اور فنون میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا اس نے اپنے دور حکومت (۱۷۷۲ء۔۱۷۸۵ء) میں ہندوستان کی قدیم تاریخ، قوانین اور رسوم ورواج کے بارے میں تحقیقی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا۔ اس کے عہد کے دو مستشرقین نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جو کہ ولیم جونز (William Jones) اور چارلس ویلکنز (Charles Wilkins) ہیں ولیم جونز ۱۷۸۴ء میں ہندوستان آیا اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا جو کہ عبرانی، یونانی، اطالوی، عربی اور فارسی ہیں ہندوستان آ کر اس نے سنسکرت زبان سیکھنے میں دلچسپی لی اور اپنے آپ کو اسی کے ماہر کی حیثیت سے منوایا۔ وہ کلکتہ کے سپریم کورٹ سے بحیثیت جج وابستہ رہا۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے وارن ہیسٹنگز کی خواہش پر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۸۸ء میں اس ادارے سے Asiatick Research کے عنوان سے رسالے

کا اجراء ہوا جس نے ہندوستان کی تاریخ وادب سے متعلق تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی سے سنسکرت ادب کے تراجم ہوئے اس کے علاوہ عہد وسطیٰ کے تاریخی ادب کی ترتیب و تدوین اور دوبارہ اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چارلس ویلکنز بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم اور سنسکرت سے دلچسپی رکھنے والا محقق تھا اس نے 'بھگوت گیتا' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ہنری تھامس کولیبروک (Henry Thomas Colebrooke) کو ولیم جونز کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں اسے گورنر جرنل ویلزلی (Wellesley) نے فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۸۲۳ء میں اس نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس نے ہندوستان سے متعلق علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ کے بارے میں تلاش و تحقیق کا کام الیگزنڈر کننگھم (Alexander Cunningham) کی وجہ سے آگے بڑھا۔ اسے ہندوستان کے آرکیالوجیکل سروے کے تخلیق کار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔[۶] ۱۸۷۰ء میں اسے شعبہ آثار قدیم کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس نے آثار قدیمہ سے متعلق تحقیقات میں مختلف جگہوں اور دریافت ہونے والے آثاران میں شامل مختلف اشیا مثلاً مجسمے، سکے، استعمال کی اشیا اور پتھر وغیرہ کے مطالعے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ متذکرہ محققین کی تحقیقات کے نتیجہ میں قدیم ادب، دستاویزات، مخطوطات، تاریخی آثار اور سکوں وغیرہ کے مطالعہ کی تاریخی تحقیق میں اہمیت اجاگر ہوئی اور کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق متعارف ہوا۔ ان مستشرقین کے ذریعہ دنیا کے سامنے ہندوستان کی ایک مثبت تصویر سامنے آئی اور اسے دنیا کی اہم تہذیبوں میں جگہ ملی۔ یہ رومانیت پسند رجحان صرف برطانوی اقتدار کے ابتدائی دور سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ جب ہندوستان کی تاریخ، تہذیب وثقافت وغیرہ کے بارے میں منفی نظریات کے حامل رجحانات فروغ پا رہے تھے اس وقت بھی تاریخ نگاری سے وابستہ برطانوی منتظمین کے ایک حلقہ کی علمی سرگرمیاں رومانیت پسند رویہ کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان منتظمین میں ایک نمایاں نام ماؤنٹ اسٹیورٹ الفنسٹن (Mountstuart Elphinston) کا ہے۔ اسے نیا مستشرق بھی کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس کی تحریر میں استعماری رویہ کی جھلک نظر آتی ہے لیکن ہندوستان کی تاریخ وثقافت سے گہرا لگاؤ نمایاں ہے۔ دراصل وہ جیمس مل (James Mill) کے ان افادیت پسند (Utilitarian) نظریات کا کڑا ناقد تھا جو ہندوستان کی تاریخ کو جمود کا شکار اور اس کی مذہبی و

تہذیبی روایات کو فرد اور معاشرہ کی ترقی کے لیے مضر سمجھتا تھا۔ الفنسٹن کی کتاب *History of Hindu and Muhammadan India*، ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی بقول گریوال 'اس نے ہندو اور مسلمان میں تفریق کیے بغیر ہندوستانی ماضی کا مطالعہ پوری خیالی ہمدردی کے ساتھ کیا۔'[۷] نئے مستشرقین کے اس حلقے میں الفنسٹن کے علاوہ تھامس منرو، جیمس گرانٹ ڈف اور جیمس ٹوڈ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ہندوستان کی علاقائی اور گروہی تاریخ کی طرف توجہ دی اور ذاتی دلچسپی اور لگاؤ کی بنا پر علاقائی تاریخ پر قلم اٹھایا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں رومانیت پسند حلقہ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں، اہم اور اثر انداز ہونے والا رجحان انجیلی دبستان (Anglicist School) کا تھا جو برطانوی کردار، روایات اور اقدار کی برتری کا قائل تھا۔ اس حلقہ میں لبرل، افادیت پسند، انتہا پسند اور عیسائی مذہبی نظریات (Evengelical) رکھنے والے تمام نظریاتی گروہ شامل تھے اور ان کے رجحانات برطانوی منتظمین کے رویوں پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے۔ مجموعی طور سے یہ حلقہ استعماری رجحانات سے بھرپور تھا اسے مشرق کی تاریخ اور روایات سے کوئی رومانوی لگاؤ نہیں تھا بلکہ وہ اسے بربریت کے دور سے تعبیر کرتا تھا جس میں کوئی پہلو قابل ستائش نہیں تھا۔ یوں بھی اس دور میں برطانوی تسلط مستحکم اور وسعت اختیار کر گیا تھا اور برطانوی منتظمین کے مقامی لوگوں سے سماجی روابط کم ہونے لگے تھے۔ ان میں اپنی برتری اور جداگانہ حیثیت کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا۔

افادیت پسند، انتہا پسند (Radicals) اور لبرل بنیادی طور پر ایک ہی فکر کے حامل تھے۔ سری دھرن کے مطابق:

> افادیت پسند فلسفہ یہ تھا کہ ہر ادارہ خواہ وہ سیاسی ہو، مذہبی یا سماجی اس کی جانچ کا معیار اس کی افادیت ہے۔ کوئی چیز اس وقت تک اہمیت کی حامل ہے جب تک وہ کارآمد ہو، اگر وہ فائدہ مند نہ ہو اور جو ادارے لوگوں کی فلاح کا کردار ادا نہیں کر سکتے ان کی یا تو تجدید ہونی چاہیے یا پھر انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ اور یہ تجدید آفاقی تعلیم اور سرکاری اداروں کی تنظیم نو کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔[۸]

افادیت پسند، مغربی دنیا میں فروغ پانے والے عقلیت پسند اور انسان دوست رویہ سے متاثر تھے۔ وہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں دوسری تمام تہذیبوں کو انحطاط اور جمود کا شکار سمجھ رہے تھے اور اسی تناظر میں انہوں نے ہندوستانی تہذیب کو بھی دیکھا اور اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اسے قدامت و جہالت سے نکالیں۔ اور ہندوستانی معاشرہ کو ایک ترقی یافتہ اور متحرک معاشرہ میں بدل دیں۔ اس کا نتیجہ تعلیمی اور حکومت کی انتظامی و ادارتی اصلاحات کی صورت میں سامنے آیا۔ تاریخ نویسی میں اس رجحان کا اہم نمائندہ جیمس مل (James Mill) ہے۔ جو مغرب کی نسلی، علمی، سماجی اور سیاسی برتری کا قائل تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ تھا لیکن کبھی ہندوستان نہیں آیا اور نہ ہی وہ فارسی یا کسی دوسری مقامی زبان سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے ثانوی مآخذ پر، جو کہ زیادہ تر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور حکومتی رپورٹ وغیرہ پر مشتمل تھے انحصار کرتے ہوئے ۱۸۱۷ء میں چھ جلدوں پر مشتمل ہندوستان کی تاریخ پر کتاب شائع کی۔ یہ کتاب *History of British India* کے عنوان سے شائع ہوئی اور اس میں ولیم جونز کے اس مفروضہ کو نشانہ بنایا گیا کہ قدیم ہندوؤں میں تہذیب کی اعلیٰ روایات موجود تھیں۔ اس کے نزدیک ہندوستانی معاشرہ اپنے آغاز سے یعنی آریاؤں کی آمد سے لے کر انگریزوں کی آمد تک جمود کا شکار اور ہمیشہ جابر حکمرانوں کے زیر اثر رہا۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندوؤں کی قدیم تاریخ اور روایت پر کڑی تنقید کی اور ہندو مسلم تفریق کو نمایاں کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے مذہبی تعصب کو ابھارا اور دو قومی نظریہ کو جواز فراہم کیا۔[9] جیمس مل کی کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت ہندوستان کی تاریخ کی تین ادوار میں تقسیم ہے جو کہ ہندو تہذیب، مسلم تہذیب اور برطانوی دور ہے۔ یہ ایک عمومی تقسیم تھی جس میں ابتدائی دو ادوار کو مذہبی حوالے سے شناخت کیا گیا ہے۔ اس تقسیم پر تاریخ کے محققین کی جانب سے تنقید بھی کی گئی کیونکہ پورے ہندوستان پر کبھی بھی مکمل طور پر ہندو یا مسلم تہذیب و اقتدار نہیں رہا دوسرے یہ کہ اگر پچھلے دو ادوار کی تقسیم مذہبی حوالے سے تھی تو برطانوی دور پر یہ تقسیم کیوں نہیں لاگو کی گئی۔ اگرچہ ہندوستان کی تاریخ پر بعد کی کتابوں میں ہمیں قدیم تاریخ، عہد وسطیٰ کی تاریخ اور جدید تاریخ کے عنوانات کے حوالے سے تاریخ کی تقسیم نظر آتی ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ وہی تقسیم ہے جو جیمس مل نے کی تھی۔ *History of British India* کو برطانیہ کے علمی و انتظامی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۵۷ء تک اس کی پانچ اشاعتیں ہوئیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی

کے ملازمین کے تربیتی کالج ہیلیبری (Haileybury) کے تربیتی نصاب میں شامل رہی جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے عام برطانوی اور منتظمین کی فکر کو کس حد متاثر کیا ہوگا۔ یوں بھی مل کا ہندوستان کے بارے میں فلسفہ برطانوی نظریہ سامراجیت کے عین مطابق اور اس وقت کے مقبول فکری رجحان کا عکاس تھا۔

نظریہ افادیت کا حامل دوسرا نمایاں مورخ جس نے جیمس مل کی روایت کو آگے بڑھایا وہ ہنری ایلیٹ (Henry Elliot) ہے۔ اگر جیمس مل کے یہاں ہمیں ہندو تہذیب و ثقافت پر زیادہ کڑی تنقید نظر آتی ہے تو ایلیٹ کے یہاں مسلم دور حکومت پر۔ ایلیٹ نے برصغیر کی تاریخ پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی اور اس کا تحقیقی کام عہد وسطیٰ کے تاریخی مخطوطات کی تلاش، انتخاب اور اس کے تراجم کرکے ترتیب دینے پر مشتمل ہے جس میں اس کا مددگار ڈاؤسن (Dowson) رہا۔ عہد وسطیٰ کے تاریخی ادب کا یہ انتخاب آٹھ جلدوں میں *History of India as Told by its Own Historians* (۱۸۶۷ء۔۱۸۷۷ء) کے عنوان سے شائع ہوا۔ کتاب کے تعارفی باب اور مخطوطات سے منتخب کیے گئے حصوں سے ایلیٹ کا نظریہ افادیت کا حامل ہونا واضح نظر آتا ہے[۱۰] اس نے کوشش کی ہے کہ مسلم دور کے منفی پہلوؤں کو ابھار کر نمایاں کرے اور ساتھ ہی ہندوؤں پر مسلمانوں کی زیادتیوں کو تاکہ مسلم دور کے مقابلہ میں برطانوی دور حکومت کی خوبیوں کو اجاگر کیا جاسکے اور اسے پچھلے دور کے مقابلے میں بابرکت سمجھا جائے۔ ایلیٹ کا یہی کہنا تھا کہ اس تاریخی ادب کا مطالعہ ہم میں اپنے ملک اور اہمیت کے حامل اس کے اداروں کی محبت اور چاہت کا جذبہ پیدا کرے گا۔[۱۱] فارسی مآخذ کے ان انگریزی تراجم سے ان مورخین نے کثرت سے استفادہ کیا جو فارسی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور یوں انہوں نے تراجم اور مآخذ کے انتخاب کو بغیر جانچے وہ کچھ قبول کیا جو ایلیٹ انہیں دینا چاہ رہا تھا۔ اس اعتبار سے ایلیٹ نے نئے برطانوی منتظمین اور مورخین کو متاثر کیا۔

افادیت اور لبرل دبستان کے ساتھ اس دور میں انگلیلی (Evangelical) نظریہ بھی مقبول تھا جو کہ عیسائی مذہبی برتری کا حامل تھا۔ یہ زیادہ تر عیسائی مشنریز پر مشتمل تھا۔ افادیت پسندوں کی طرح یہ بھی ہندوستان کو ظلم و بربریت کے دور میں سمجھتے تھے اور انہوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت خصوصیت سے ہندومت اور اسلام کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اگر ایک جانب

افادیت پسند یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی معاشرہ کی اصلاح اور اس میں تبدیلی قانون سازی کے ذریعہ ہوسکتی ہے تو انگلیلی کے نزدیک ایسا عیسائیت قبول کرکے ہوسکتا ہے۔[12] ان کے نزدیک عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعہ ہندوستان کے لوگوں کو اوہام پرستی اور انحطاط سے نجات دلائی جاسکتی تھی۔ راجا ڈکشت افادیت پسند اور انگلیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> برطانیہ میں انگلیلی، لبرل اور افادیت پسند مفکرین سے شدید اختلافات رکھتے تھے لیکن ہندوستان میں دونوں حلقوں کے تبدیلی مذہب کی روح، تہذیبی مشن اور تجارتی مفادات، برطانوی استعماریت کے تحت یکجا ہوگئے تھے۔[13]

انگلیلی رجحان کا اہم نمائندہ چارلس گرانٹ (Charles Grant) ہے۔ اس کے خطوط کے مجموعے جو اس کے ہندوستان کے بارے میں مشاہدات پر مشتمل ہیں *Observations on the State of Society among the Asiatic Subjects of Great Britain* کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اس میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور مذاہب پر تنقید کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ اور نئے تعلیمی نظام کی ہندوستان میں اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

افادیت پسند اور انگلیلی دبستان کے حامل برطانوی منتظمین نے جس طور برصغیر کی تاریخ کو اپنی نظریاتی اور انتظامی ضروریات کے تحت برتا اس نے برطانوی استعماریات کے نظریے کو اور مستحکم کردیا۔ اور یورپ کے علوم وفنون، مذہب ومعاشرت، سیاست ومعیشت اور اخلاقی و تہذیبی ہر اعتبار سے مشرق پر برتری کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ جس پر انیسویں صدی کے اواخر میں رڈیارڈ کپلنگ کے نظریہ 'سفید آدمی کا بوجھ' (۱۸۹۹ء) نے یورپ کی نسلی برتری اور اس پر دوسری اقوام کی تہذیب واصلاح کی ذمہ داری ڈال کر استعماریت کے نظریہ کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔

متذکرہ نظریاتی مورخین کے علاوہ برطانوی منتظمین کے ایک حلقہ نے ان علاقوں کی تاریخ میں دلچسپی لی کہ جہاں ان کی تقرری ہوئی تھی۔ ان علاقوں کی تاریخ مرتب کرتے وقت انہوں نے مقامی تاریخی ادب، روایات، سرکاری گزیٹیرز اور ریکارڈ وغیرہ سے مدد لی اس ضمن میں اکثر

انہیں حکومت کی طرف سے آسانیاں بھی فراہم کی گئیں۔ان علاقائی تاریخی کتب میں چند نمائندہ جیمس گرانٹ ڈف(James Grant Duff) کی دو جلدوں پر مشتمل *A History of the Marathas*(۱۸۲۶ء)، ہملٹن(Hamilton) کی *Assam*، مارک ولکیز (Mark wilkes) کی *History of Mysore*، جوزف ڈیوی کنٹھم (Joseph Devy Cunningham) کی *History of the Sikhs*، اولف کیرو(Olaf Caroe) کی *The Pathans*، میلسن (Malleson) کی *Native States* اور جیمس ٹوڈ(James Tod) کی مشہور کتاب *Annals and Antiquities of Rajasthan*(۱۸۲۹ء۔۱۸۳۲ء) وغیرہ ہیں۔

علاقائی تاریخ لکھنے کے علاوہ اب برطانوی مورخین ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کی تاریخ بھی اپنے ہموطنوں کے لیے تحریر کرنا چاہتے تھے۔اس ضمن میں ایک مقبول طریقہ سوانح نگاری کا منتخب کیا جس کے ذریعہ ان شخصیات کو منتخب کیا گیا جنہوں نے مشکل حالات میں برطانوی اقتدار کو مستحکم کیا۔میکالے نے *Essay on Clive* لکھی جس میں وائسرائے کلائیو کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس پر ای ٹی اسٹوکس(E.T.Stokes) کا تبصرہ صرف میکالے پر ہی نہیں بلکہ دوسری لکھی گئی سوانح کے پیچھے کارفرما مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسٹوکس کے مطابق میکالے نے انگریز ذہن کو سمجھتے ہوئے ہندوستان کی تاریخ کو سوانح نگاری کے ذریعے دلچسپ بنا کر پیش کیا کیونکہ اسوقت کے وکٹورین عوام صرف ماضی کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ ان شخصیات کے بارے میں جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے جو اعلیٰ قومی کردار کی مثال پیش کرسکیں اور بتاسکیں کہ انفرادی طور پر افراد کس طرح تاریخ کے دھاروں کو بدلتے ہیں۔[۱۴] ولیم ہنٹر نے *The Rulers of India* کے عنوان سے سلسلۂ کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت اٹھائیس مختصر کتب شائع ہوئیں جو کہ زیادہ تر برطانوی منتظمین کی فوجی کامیابیوں اور زندگی کے بارے میں تھیں ان اٹھائیس میں سے صرف چھ ہندوستانی حکمرانوں سے متعلق تھیں جی بی میلسن نے *Rulers of India Series* میں تین حصے لکھے اور ہندوستان میں برطانوی کامیابیوں کو انگریز اور ہندوستانی کردار کے تناظر میں جانچا۔ انیسویں صدی کے وسط میں نئے سیاسی حالات و واقعات نے بھی برطانوی مورخین کو اپنی جانب

متوجہ کیا اس حلقہ میں بھی برطانوی منتظمین نمایاں تھے جس امر نے مورخین کی سب سے زیادہ توجہ حاصل کی وہ ۱۸۵۷ء کے واقعات تھے۔ اس کا فوری ردعمل مختلف پمفلٹ اور کتابچوں کی صورت میں آیا جس میں اس واقعہ کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں مختلف طبقہ اپنی رائے دے رہے تھے فوجی ماہرین کے نزدیک اس کا سبب جنگی حکمت عملی کی خامیاں تھیں، انگلیلی حلقہ کے نزدیک حکومت کی لامذہبیت، کچھ کے نزدیک حکومت کا کمرشل ازم اور سیاستدانوں کے نزدیک انتہا پسند (Radicals) کی غلط پالیسیاں تھیں جنہوں نے پرانے معاشرے میں نئے نظام کا غلط طریقے سے نفاذ کیا۔[۱۵] بہر حال اس ضمن میں میلسن کی *Red Pamphlet*، اور جان ولیم کے کی *The History of the Sepoy War* اہم ہیں۔

برطانوی منتظمین کے مورخین کے حلقہ میں ایک نمایاں نام ولیم ہنٹر کا ہے اس نے *Indian Musalmans* لکھی جس میں برطانوی حکومت کی توجہ بنگال کے مسلمانوں کی دگرگوں حالت کی جانب دلائی اور انہیں ان کی حکمت عملی میں تبدیلی کا مشورہ دیا۔ ہنٹر کا ایک اہم کام گزیٹیرز کی تیاری ہے۔ اس کے علاوہ اس نے *Rulers of India* اور *Annals of Rural Bengal* لکھیں۔ بیسویں صدی میں برطانوی مورخین میں سب سے نمایاں نام ونسٹ اسمتھ کا ہے اس نے برصغیر کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں جیسا کہ *Early History of India* (۱۹۰۴ء)، اور *Akbar the Great Mughal* (۱۹۱۹ء) ہے جسے ایک عرصہ تک ہندوستان کی تاریخ پر اہم کتاب کی حیثیت حاصل رہی اگر چہ اسمتھ کے یہاں بھی سامراجی نقطہ نظر پایا جاتا ہے لیکن عمومی طور پر ہندوستان کی تاریخ کی جانب اس کا رویہ ہمدردانہ اور عملیت پسندی (Pragmatic) کا حامل ہے۔

انگریز منتظمین کی یہ تاریخ نویسی مختلف دھاروں کی نشاندہی کرتی ہے جس پر بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور مغرب میں فروغ پانے والے نئے نظریات وعلمی وتحقیقی رجحانات نے اپنا اثر ڈالا۔ نظریاتی سطح پر رومانیت پسند، افادیت پسند، لبرل، انگلیلی افکار کی روشنی میں تاریخ کا تجزیہ کیا گیا، انتظامی مقاصد کے تحت ہندوستان کی علاقائی تاریخ کی جانب توجہ دی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کا تجزیہ کیا گیا۔ برطانوی عوام کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے سوانح نگاری کی جانب توجہ دی گئی اور کچھ منتظمین نے تاریخ کے علم سے ذاتی دلچسپی کی بنا پر علمی وتحقیقی سرگرمیوں میں

حصہ لیا اور جدید منہاجیات تحقیق کو فروغ دیا۔ اس پورے تاریخی ادب میں اگر سامراجی رویہ واحد نہیں تو سب سے نمایاں اور غالب رجحان رہا۔ جس کا ردعمل پھر ہندوستانی مورخین کے یہاں سامنے آیا جسے مخصوص موضوعات اور مقاصد کی روشنی میں ہندو اور مسلمان مورخین کی تاریخ نویسی بھی کہا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اکرام، 'رود کوثر' (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۴ء)، صفحہ ۶۲۹

۲۔ ایل پی مادھر، *Hitoriography and Historians of Modern India* (دہلی: انٹر انڈیا پبلشرز، ۱۹۸۶ء)، صفحہ ۱۰۱

۳۔ ای سری دھرن، *A Text Book of Historiography: 500 BC to AD2000* (نئی دہلی: اورینٹ لونگ مین، ۲۰۰۰ء)، صفحہ ۱۲۸

۴۔ جے ایس گریوال، 'دور وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات'، ہندوستانی دور وسطیٰ کے مورخین، محب الحسن (مرتبہ) (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، صفحہ ۳۸۲

۵۔ پرسیول اسپیئر، *A History of India*، جلد دوئم (کلکتہ: پینگون بکس، ۱۹۹۰ء)، صفحہ ۱۲۱

۶۔ سری دھرن، محولہ بالا، صفحہ ۳۹۶

۷۔ گریوال، محولہ بالا، صفحہ ۳۸۶

۸۔ سری دھرن، محولہ بالا، صفحہ ۴۰۱

۹۔ رومیلا تھاپر، پبن چندر، ہربنس مکھیا، *Communalism and the Writings on Indian History* (نئی دہلی: پیپلز پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷ء)، صفحہ ۴

۱۰۔ دیکھئے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن *History of India as Told by its own Historians*، جلد اول، اشاعت دوم (لاہور: اسلامک بک سروسز، ۱۹۷۹ء)، صفحات XXVII-XVI

۱۱۔ ایضاً، صفحہ XXV

۱۲۔ رومیلا تھاپر، *Ancient Indian Social History: Some Interpretations* (نئی دہلی: اورینٹ لونگ مین، ۱۹۸۷ء)، صفحہ ۴

۱۳۔ راجا ڈکشت، 'Orientalism and History'، *Hitoriography Past and Present*، کرت کے شاہ، مہر جیوتی سنگلے (مرتبین)، (نئی دہلی: روات پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، صفحہ ۶۳

۱۴۔ ای ٹی اسٹوکس، 'The Administrators and Historical Writing'، *Historians of India, Pakistan and Ceylon*، سی ایچ فلپ (مرتبہ)، (لندن: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۷ء)، صفحہ ۳۸۵

۱۵۔ ایس این سین، 'Writings on the Mutiny'، ایضاً صفحہ ۳۷۳

آپ بیتی اور تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

لڈل ہارٹ نے اپنی کتاب 'ہم تاریخ سے کیوں نہیں سیکھتے؟' میں پہلی جنگ عظیم کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ، جنگ کے دوران ایک دن شام کے وقت، ایک فرانسیسی جنرل نے اپنے اسسٹنٹ کو دن کا حال لکھاتے ہوئے کہا کہ فلاں محاظ پر آج سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی، ہمارے فوجی بڑی بہادری سے لڑے اور دشمن کو پسپا کر دیا، اسسٹنٹ لکھتے لکھتے تھوڑی دیر کے لئے رکا اور جنرل سے کہنے لگا کہ مگر آج تو اس محاذ پر کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ 'یہ تاریخ کے لئے ہے۔' جنرل نے سنجیدگی سے کہا اور بقایا املا کرانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی طرح جب پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں چرچل کی کتاب *World Crisis* چھپ کر آئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، بالفور، جو اس وقت برطانوی وزیر خارجہ تھا، اس نے کہا کہ چرچل نے اپنے بارے میں صحیح کتاب لکھی ہے، مگر اس کا عنوان غلط دیدیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگ کیوں اپنی آپ بیتی یا سوانح عمری لکھتے ہیں؟ جواب میں جو باتیں ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں: اپنی شخصیت کو ابھارنے اور اسے تاریخی حیثیت دینے کے لئے، ایسے پہلوؤں اور گوشوں کو بے نقاب کرنے کے لئے کہ جنہیں عام تاریخ میں جگہ نہیں ملی، یا دی گئی، واقعات کی حقیقت بیان کرنا، یا انہیں مسخ کرنا اور اپنے نقطۂ نظر سے انہیں تفصیل سے لکھنا، یا مختصراً ان کا ذکر کرنا، تاکہ پوری بات واضح نہ ہو، انفرادی طور پر آپ بیتی لکھنے والوں نے جو غلطیاں کی ہیں، سازشوں میں شریک رہے ہیں، جوڑ توڑ کیا ہے، دھوکہ دہی، فریب اور بدعنوانیاں کی ہیں، اب ان داغوں کو دھو کر اپنی معصومیت اور بے گناہی کو ثابت کرنا۔

آپ بیتی لکھنے والے ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں، ان میں شاعر، ادیب، فن کار،

سیاستدان، حکمراں، فوجی جنرل اور کبھی کبھی عام زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ۔ اسی حساب سے ان کی آپ بیتی کا تعین ہوتا ہے خاص طور سے سیاستداں، حکمراں اور فوجی جنرل جب آپ بیتیاں لکھتے ہیں تو ان کے ہاں اپنی ذات کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے، وہ واقعات کو اپنی ذات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، حالات و ماحول کا ان کی ذات پر کیا اثر ہوا، اس کا ذکر کم ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے ہاں واقعات کی سچائی، یا درستگی کے بارے میں ہمیشہ شک وشبہات ہوتے ہیں، ان کے ہاں واقعات کو مسخ بھی کیا جاتا ہے، انہیں گھڑا بھی جاتا ہے، ان میں کتر بیونت بھی کی جاتی ہے، اور ان کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ جس میں ان کی ذات ابھر کر آئے۔ وہ اس ذریعہ سے اپنی ذات کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں دوسروں کو یا تو شریک نہیں کرتا، یا اس حد تک کرتا ہے کہ جہاں اس کی ذات کو نقصان نہ پہنچے۔ ذات کے حوالے سے اپنے زمانے، ماحول، حالات اور واقعات کو دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پبلک واقعات کو ذاتی بنا دیتا ہے۔

مورخوں اور نفسیات دانوں نے اس پر بحث کی ہے کہ حافظہ کی بنیاد پر جو آپ بیتی لکھی جائے، وہ کس حد تک قابل اعتبار ہوتی ہے، کیونکہ انسان کا حافظہ عمر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، وہ بہت کچھ یاد رکھتا ہے، مگر ساتھ ہی میں بہت کچھ بھلا بھی دیتا ہے، وہ اپنی یادوں میں اضافے اور ترمیم بھی کرتا رہتا ہے، اس طرح حافظہ واقعات کی شکل بدلتا رہتا ہے، لہٰذا ان میں جو کچھ بیان ہوتا ہے، وہ کس حد تک قابل اعتبار ہے؟ مورخ کے لئے یہ ایک مشکل کام ہوتا ہے کہ وہ جائزہ لے کہ کس حد تک مبالغہ ہے، اور کس حد تک سچائی۔

ہوتا یہ ہے کہ جب یادداشتوں میں کسی غلط واقعہ کو یقین کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور اگر اس کو چیلنج نہیں کیا جائے تو وہ تاریخ کا صحیح واقعہ بن جاتا ہے، کیونکہ یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ سچا اس لئے ہے کہ آنکھوں دیکھا ہے، یا جب یہ خاص واقعہ وقوع پذیر ہوا تو لکھنے والا اس وقت موجود تھا، یا اس نے جن لوگوں سے اس کے بارے میں سنا، ان کی شہادت پر اس کو بیان کیا، لہٰذا اس میں سچائی ہے۔ کبھی حقیقت جاننے کے لئے دوسرے ذرائع کی جانب جانا ہوتا ہے جو اس کی تصدیق کرتے ہیں، یا اسے رد کرتے ہیں، لیکن اگر دوسرے ماخذ یا ذرائع نہ ہوں تو یہی حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا آپ بیتیوں اور یادداشتوں کی بنیاد پر

ماضی کو تشکیل دیا جا سکتا ہے؟ ان کی ایک اہمیت تو مورخوں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ بیتی، اگرچہ ایک فرد کے گرد گھومتی ہے، مگر وہ فرد سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس لئے وہ جن حالات میں زندگی گذارتا ہے، اس کی روایات، رسم ورواج، اور عادات ورویوں کو وہ اختیار کر لیتا ہے، اس وجہ سے وہ اپنے وقت اور حالات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی ذات میں اس کا ماحول سمویا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے مطالعہ سے اس کے عہد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرے ماضی کی تشکیل، اکثر حال کی ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہے کہ کن حالات میں ماضی کی کیا شکل ہونی چاہئے، اس لئے ماضی کی تشکیل بدلتی رہتی ہے، اس عمل میں آپ بیتیاں یقیناً اہم کردار ادا کرتی ہیں کیونکہ ان کی مدد سے ایک منتخب ماضی کی تلاش کی جاتی ہے، اور پھر اس کو تعمیر کیا جاتا ہے۔

لیکن مورخ آپ بیتیوں اور یادداشتوں کی بنیاد پر تشکیل شدہ ماضی کو برابر چیلنج کرتے رہتے ہیں، کیونکہ تاریخ نویسی میں واقعات کو شہادت کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے، پھر اس واقعہ کی وجہ اور نتیجہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس کے بارے میں ایک رائے یا نقطۂ نظر کو پیش کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی کے مقابلہ میں تاریخ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، یہ ماضی کو کسی ایک ذات یا شخصیت کی نظر سے نہیں دیکھتی ہے، بلکہ حالات کے تناظر میں ان کا جائزہ لیتی ہے، اس میں اسباب وعلل ونتائج ہوتے ہیں، اور واقعات کا تجزیہ کسی تھیوری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ تاریخ کا ایک ماخذ تو ہوتی ہے، مگر تاریخ نویسی کا مکمل انحصار اس پر نہیں ہوتا ہے۔

اگر ہم آپ بیتی کے دائرے میں ڈائری کو بھی شامل کر لیں تو اس صورت میں اس کی شکل اور زیادہ بدل جاتی ہے۔ ڈائری ایک تو تاریخ یا سنہ وار ترتیب سے لکھی جاتی ہے، اور لکھنے والا ہر روز، یا اہم دنوں کے واقعات اور تجربات کو بیان کرتا ہے۔ اکثر یہ ڈائریاں ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں، اور لکھنے والا، ان کو شائع کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہے، لیکن اب وقت کے ساتھ ایسے لوگوں کی ڈائریاں سامنے آئی ہیں کہ جو ذاتی نوعیت کی تھیں، مگر ان میں اپنے وقت کے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے، اس لئے ان کی تاریخی حیثیت ہوگئی، اور اب محققین انہیں استعمال کر کے تاریخ کے دائرے کو بڑھا رہے ہیں۔

آپ بیتیوں، اور ڈائریوں کے موضوعات دو قسم کے ہوتے ہیں، سماجی، ادبی اور ثقافتی یا

سیاسی جن آپ بیتیوں میں سماجی، ثقافتی یا ادبی نوعیت کے موضوعات ہوتے ہیں، وہ اس قدر متنازعہ نہیں ہوتے ہیں، ان کے ذریعہ مورخین سماج کی کلچرل تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں۔ مغل تاریخ میں اس کی بہترین مثال گلبدن بیگم کی یادداشتوں کا مجموعہ 'ہمایوں نامہ' ہے۔ اس میں اس نے مغل خاندان، عورتوں، بچوں، خاندان کے باہمی تعلقات اور سماجی تقریبات کا حال لکھا ہے، جس کے پس منظر میں سیاسی واقعات بھی آ گئے ہیں جو ثانوی نوعیت کے ہیں۔ یہ ایک عورت کی زبانی اس عہد کی داستان ہے کہ جس میں جنگ وجدل اور قتل وغارت گری کا تذکرہ نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں شاہی شان وشوکت ہے، بلکہ وہ حالات ہیں کہ جو عام لوگوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔

اسی طرح جوہر آفتابچی کی 'تذکرۃ الواقعات' ہے جس میں ایک معمولی ملازم اپنے عہد کے واقعات کو دیکھ رہا ہے، خاص طور سے ہمایوں کی جلاوطنی کہ جس میں لوگوں کے رویے بدل گئے، روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے لوگوں کی ذہنیت اور ان کے طور طریق کا پتہ چلتا ہے۔

مغل بادشاہوں میں سے بابر اور جہاں گیر نے اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ بابر کی آپ بیتی 'توزک بابری' کو ڈائری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے واقعات کو سنہ وار بیان کیا ہے، اس میں اس کی پوری شخصیت ابھر کر آتی ہے۔ اس کی توزک میں جو دلکشی، خوبصورتی اور بیان کا بہاؤ ہے' توزک جہانگیری' میں نہیں، مگر یہ دونوں تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔

آپ بیتیاں چونکہ لکھنے والے کی شخصیت، اس کی رائے، اور اس کے نقطۂ نظر کو بیان کرتی ہیں، اس لئے جعلی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں، توزک تیموری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تیمور کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ جہاں گیر کی ایک توزک کسی اور نے لکھ دی تھی، جو اسی طرح مقبول ہوئی جیسی اصلی، اس کے اردو اور انگریزی ترجمہ بھی ہوئے، حال ہی میں ہٹلر کی ڈائریوں کو برآمد کیا گیا، جس کی بھاری قیمت جرمن رسالے اسٹرن (Stern) نے ادا کی تاکہ وہ انہیں شائع کرے، بعد میں ثابت ہوا کہ یہ جعل سازی تھی۔ اسی زمانہ میں ضیاء الحق کی حکومت میں قائداعظم محمد علی جناح کی ڈائری کو دریافت کیا گیا کہ جس میں پاکستان کے لئے صدارتی طرزِ حکومت کو تجویز کیا گیا تھا، مگر جب ان کے سکریٹری خورشید احمد نے کہا کہ اس قسم کی کوئی ڈائری نہیں تھی تو یہ جعل سازی بھی وقت کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس جعل سازی کے پیچھے جو مقصد پنہاں ہوتا ہے وہ یہ کہ ان تاریخی شخصیتوں کے سہارے اپنے مفادات کو پورا کیا جائے۔ کبھی اس کا مقصد مالی منافعت ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں رومی جنرلوں نے اپنی آپ بیتیاں یا یادداشتیں لکھنی شروع کیں تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جو تاریخ سے خوف زدہ تھے اور انہوں نے جو بدعنوانیاں اور غلطیاں کیں تھیں، اپنی آپ بیتیوں کے ذریعہ انہیں یا تو صحیح ثابت کرنا چاہتے تھے، یا ان سے انکار کر کے، اپنے ماضی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے بیانات کے ذریعہ خود کو پاک وصاف بنا کر تاریخ میں اپنا قابل عزت مقام بنانا چاہتے تھے۔

شاید یہی جذبہ اس وقت پاکستان میں سیاستدانوں، فوجی جنرلوں، اور بیوروکریٹس کے ذہن میں ہے کہ جنہوں نے اقتدار میں رہتے ہوئے اس ملک کی تاریخ کو مسخ کیا۔ اب یہ لوگ آپ بیتیاں لکھنے میں مصروف ہیں، کہ جن میں یہ لوگ سب بدعنوانیوں، غلطیوں سے پاک و صاف عوام دوست اور جمہوریت کے چیمپئن ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ چونکہ یہ آپ بیتیاں ہم عصر لوگ لکھ رہے ہیں، اس لئے خود کو تمام گناہوں سے بچا کر تمام الزامات اپنے ہم عصر سیاستدانوں، جنرلوں اور نوکر شاہی کے عہدے داروں پر رکھ رہے ہیں۔ مثلاً مشرقی پاکستان کے المیہ کی یادداشتیں پڑھ لیں، ان میں ایک دوسرے پر الزام تراشی ہے، کوئی اپنی غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ تاریخ کو مسخ کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور ہر شخص اپنی ایمانداری اور خلوص کو ثابت کر کے تاریخ میں اپنے لئے کسی معتبر جگہ کی تلاش میں ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ان لوگوں کے بیانات کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں، ہمارے ہاں تاریخ نویسی کی روایات انتہائی کمزور ہیں، اس لئے جو کچھ ان آپ بیتیوں میں لکھا جا رہا ہے، اسی کو تاریخ سمجھا جا رہا ہے، اگر ان کو چیلنج نہیں کیا گیا، ان کے تضادات کو واضح نہیں کیا گیا اور ان کے جھوٹ کو ثابت نہیں کیا گیا تو یہی پاکستان کی تاریخ ہو جائے گی۔

اردو میں تاریخ نویسی

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ نویسی کئی نظری تبدیلیوں سے گذرنے کے بعد اپنے دائرہ کو وسیع کر چکی ہے۔ اب یہ سیاست، معیشت، کلچر اور سماجی موضوعات کے علاوہ انسانی جذبات، احساسات اور رویّوں کو بھی اپنے دائرۂ کار میں لے آئی ہے۔ ایک وقت تھا کہ تاریخ کا گہرا تعلق ان طبقوں سے تھا کہ جن کے پاس اقتدار، دولت اور طاقت تھی، لیکن اب مورخوں نے 'طاقت' کے مفہوم کو بھی نئے معنی دیئے ہیں۔ یہ طاقت صرف فوج، ہتھیاروں اور دولت کے سہارے ہی حاصل نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کا تعلق ان مزاحمتی رویوں اور طریقوں سے بھی ہے کہ جو کمزور لوگوں کے پاس ہوتے ہیں، جیسے سستی و کاہلی، مشینوں کو خراب کرنا، یا توڑنا، اور مختلف بہانوں سے کام کے تسلسل میں خلل ڈالنا، یہ کمزور لوگوں کے ہتھیار ہوتے ہیں، اس لئے اب مورخ اس طاقت کے بارے میں تحقیق کر کے تاریخ نویسی کو ایک نئی جہت دے رہے ہیں۔

ایک زمانہ تک تاریخ سے غلام، عورتیں، مزدور، کسان، خانہ بدوش، چرواہے اور نچلے طبقے کے لوگ غائب رہے، اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ان لوگوں کا تاریخ کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں، اب جب سے کہ تاریخ کو نچلی سطح سے لکھا جانے اور تحقیق کیا جانے لگا ہے تو یہ لوگ بھی منظر عام پر آ رہے ہیں اور تاریخ کی تشکیل میں ان کا حصہ بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہو گیا ہے۔

موجودہ دور میں خصوصیت سے عورتوں کی تاریخ، اور ماحولیات کی تاریخ نے، تاریخ نویسی کو ایک نئی جہت دی ہے اس کے ساتھ ہی اب تک جو روایتی تاریخی مآخذ بطور سند استعمال کئے جاتے تھے، ان میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ادب جس میں شعر و شاعری، قصے کہانیاں، اور لوک

داستانیں شامل ہیں، اس سے تاریخ نویسی کو مواد مل رہا ہے، پھر زبانی تاریخ نے اس کو اور زیادہ وسعت دیدی ہے۔

تاریخ نویسی میں تین عناصر کی اہمیت ہے: اول واقعات، دوسرے ان واقعات کی سچائی کو پرکھنے کے لئے شہادت، اور پھر اس کے بارے میں مورخ کی تنقید، تفسیر یا تاویل۔ کیونکہ محض واقعات کو سنہ وار بیان کرنے سے تاریخ کی اہمیت اجاگر نہیں ہوتی ہے، اور نہ ہی اس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے، یہ محض تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کر دیتا ہے۔ اس لئے تاریخ نویسی میں اسباب، وجوہات اور نتائج کی نشان دہی ضروری ہے۔

اس لئے اب تاریخ کو لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو کسی تھیورٹیکل (نظریاتی) فریم ورک میں بیان کیا جائے، تاریخ اور تھیوری کا اب آپس میں گہرا رشتہ ہو گیا ہے، مثلاً نیشنل ازم، کمیونل ازم، مارکس ازم، اسٹرکچرل ازم، پوسٹ ماڈرن ازم وغیرہ وہ تھیوریز ہیں کہ جو تاریخ نویسی پر غالب آ رہی ہیں، اور مورخ کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تاریخی واقعات کی توجیہ اور تشریح ان کی روشنی میں کرے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے اردو تاریخ نویسی کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، اول تو ابتداء میں یہ فارسی تاریخ نویسی کے زیر اثر رہی، اردو داں طبقہ فارسی زبان سے بخوبی واقف تھا، اس لئے وہ تاریخ کو براہِ راست فارسی مآخذ کی مدد سے پڑھتے تھے۔ جدید تحقیق کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے، بنیادی مآخذ کی مدد سے تاریخ لکھنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ہمارے ہاں تعلیمی اداروں، یعنی مدرسوں میں تاریخ کا علم نہیں پڑھایا جاتا تھا، اس لئے انیسویں یا بیسویں صدی کے شروع میں تاریخ میں نصابی کتابیں یا تو لکھی نہیں گئیں یا بہت کم۔ تیسرے جدید تاریخ نویسی کی ابتداء کولونیل دور میں شروع ہوئی، اس میں ابتدائی دور میں تو اردو میں تاریخ کے موضوع پر توجہ دی گئی، مگر بعد میں تعلیم یافتہ طبقے نے انگریزی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا اور اردو کے بجائے اس میں تحقیقی کتابیں لکھنے لگے۔ اس وجہ سے اردو تاریخ نویسی کی بنیادیں کمزور رہیں، اس کمزوری کی وجہ سے اس طبقہ میں کہ جس کی پہنچ صرف اردو تک تھی، تاریخی شعور نیم پختہ رہا۔

تاریخ نویسی کسی بھی معاشرے کے نظریات، رویوں، اور خیالات و افکار کہ جن کا تعلق

سیاست، کلچر اور معیشت سے ہوتا ہے، کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر ہم ان رجحانات کے تحت اردو میں تاریخ نویسی کا تجزیہ کریں تو ہمیں اس میں قوم پرستی، پان اسلام ازم، فرقہ واریت اور صوبائی اور علاقائی شناخت کے اثرات ملتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سرسید احمد خان کی 'آثار الصنادید' قابل ذکر ہے، کیونکہ اس میں انہوں نے پہلی مرتبہ اردو میں آثار قدیمہ کو تاریخ کے ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ خصوصیت سے دہلی کی قدیم عمارتیں، جو وقت کے ساتھ شکستہ وخستہ ہو رہی تھیں، ان عمارتوں کی خستگی دراصل ایک تہذیب کا زوال تھا، جو سیاسی طور پر اپنے اثر وقوت کو کھو چکی تھی، دہلی کے شہر پر انگریزی کا راج تھا، مغل بادشاہ لال قلعہ میں محصور تھا، جو بے بسی اور بے چارگی اس وقت مغلیہ عہد کے امراء طبقے کی تھی، اس کی تصویر یہ عمارتیں تھیں۔ سرسید ان عمارتوں کی تاریخ کو محفوظ کر کے، ماضی کو محفوظ کرنا چاہتے تھے، ان عمارتوں میں قلعہ، مسجدوں، محلات، حویلیوں، کنوؤں، باولیوں، مندروں، بازاروں، میناروں اور شہر کے دروازوں کا حال ہے۔ اس سے دہلی کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی ابھر کر آتی ہے۔

قدیم آثار کے ساتھ ساتھ سرسید نے دہلی کی اہم شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب سے سرسید کے عہد کی دہلی کا نقشہ بھی ابھر کر آتا ہے کہ اس سیاسی انتشار کے عالم میں بھی یہاں اہل فن واہل علم اور اہل حرفہ آباد تھے، جو گزری تہذیب کی روایات کو سنبھالے ہوئے تھے، مگر آثار قدیمہ کی طرح یہ بھی بوسیدگی کا شکار ہو رہے تھے۔

ہندوستان کی مکمل تاریخ لکھنے کا کام مولوی ذکاء اللہ نے پورا کیا، مگر ذکاء اللہ نے تاریخ نویسی میں فارسی روایات کو اختیار کرتے ہوئے، مختلف ادوار کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کر دیا۔ ان کے ہاں واقعات کا کوئی تجزیہ نہیں ہے۔ واقعات کے لحاظ سے کتاب کا آخری حصہ قابل ذکر ہے کیونکہ یہ ہم عصر تاریخ ہے، جو چشم دید واقعات یا سنی روایات پر ہے، جیسا کہ فارسی لکھنے والے مورخوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے عہد سے پہلے کی تاریخ اس عہد کے مآخذ سے ترتیب دیدیا کرتے تھے۔ ان مآخذ پر کوئی تنقید یا بحث نہیں کرتے تھے۔

ہندوستانی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی تاریخ میں محمد حسین آزاد کی 'دربار اکبری' ایک اہم اضافہ ہے، کیونکہ اکبر بادشاہ نے جس طرح مغل حکومت کو ہندوستانی بنا کر یہاں 'صلح کل' کے

ذریعہ حکومت کی تھی، اور ایک مشترک کلچر کی بنیاد ڈالی تھی، اس کی وجہ سے اس کے عہد کو ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت ہے۔ ابھی تک اکبر مسلمان معاشرے میں متنازعہ نہیں ہوا تھا۔ محمد حسین آزاد نے اس کے آئین، امراء اور حکومت کی پالیسیوں پر نظر ڈالی ہے۔ سرسید احمد خاں، اس سے پہلے 'آئین اکبری' کا فارسی نسخہ، ایڈٹ کر کے شائع کر چکے تھے، جس پر غالب کو اعتراض تھا کہ یہ وقت پرانے آئین کا نہیں، بلکہ جدید دور کے انگریزی آئین کے مطالعہ کا ہے۔ مگر سرسید کے نزدیک اس کی اہمیت تھی، کیونکہ 'آئین اکبری' کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مغلوں کی سلطنت انتظامی لحاظ سے کس قدر اہم اداروں پر مبنی تھی۔ 'دربار اکبری' میں آزاد نے علماء کے مذہبی تعصب کو بھی نشانہ بنایا ہے، اس لئے انگریزی دور میں اس کی اشاعت اس لئے قابل ذکر ہے کہ اس نے انگریز مورخوں کے ان دلائل کی نفی کی ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندو تعصب کا شکار رہے، یا مغلوں کی حکومت مسلمانوں کی تھی اور اس میں ہندوؤں کی شرکت نہ تھی، یا مغل سلطنت کسی باقاعدہ نظام پر قائم نہیں تھی، اور ان کے دور میں ہندوستان میں انتشار و بے چینی تھی۔ جس کی وجہ سے انگریزی اقتدار دراصل اہل ہندوستان کے لئے ایک نعمت ہے۔

اردو تاریخ نویسی میں دوسری تبدیلی انیسویں صدی کے آخری دور میں اور بیسویں صدی کے شروع میں اس وقت آئی کہ جب عالمی حالات بدلنا شروع ہوئے۔ یہ حالات دو قسم کے تھے: ایک تو یورپی کولونیل طاقتیں مسلمان ممالک پر قابض ہو رہی تھیں، یا ہو چکی تھیں، دولت عثمانیہ انیسویں صدی کے آخر میں زوال پذیر ہو چکی تھی، اور بلقان ریاستوں میں اس کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں، اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا، دوسرے مغل اقتدار کے خاتمہ کے بعد، اب مسلم اشرافیہ خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگی تھی، اور ہندوستان میں رہتے ہوئے اس میں اقلیت ہونے کا احساس پیدا ہو گیا تھا ان کا یہ احساس اقلیت عالم اسلام میں شمولیت کی وجہ سے بدل جاتا تھا، دوسرے یورپی کولونیل مورخوں اور اسکالرز کی جانب سے اسلام اور اسلامی یا مسلمانوں کی تاریخ پر حملے ہو رہے تھے۔ ان حالات میں اب اردو میں بھی تاریخ نویسی میں تبدیلی آئی۔ اگرچہ یہاں بھی ابتداء سرسید نے کی تھی کہ جنہوں نے پیغمبر اسلام پر جو حملے کئے گئے تھے، ان کا جواب دیا تھا۔ مگر اس میں شبلی نعمانی کا کردار اہم ہے کہ جنہوں نے 'ہیروز آف اسلام' کے موضوع پر لکھنے کی ابتداء کی۔ ان کا مقصد دنیا کی تہذیب میں مسلمانوں کے کردار کو اجاگر کرنا تھا، یہ

تاریخ میں فرد کے کردار کو اہمیت دیتے تھے۔ مگر جب وہ بادشاہوں کی تاریخ کے بعد صحابہ و علماء کی تاریخ لکھتے ہیں تو پھر ان کے ہاں 'عقیدت' کے جذبات آ جاتے ہیں اور وہ تاریخ کو پند و وعظ کا مجموعہ بنا دیتے ہیں۔

بہر حال شبلی نے اپنے کئی مضامین کے ذریعہ، مسلمانوں کی تاریخ پر جو اعتراضات کئے گئے تھے، ان کا جواب دیا۔ ان کے بعد سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا، مگر ان کے ہاں ایک تبدیلی یہ آئی کہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو عالم اسلام کی تاریخ سے جوڑنے کی کوشش کی، ہندوستان اور عرب تعلقات میں ان کے ہاں ان ثقافتی رشتوں کا بیان ہے کہ جس سے یہ دونوں متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر مختلف معلوماتی مضامین لکھے، جیسے تاج محل کے معمار کے نام کے سلسلہ میں تحقیق وغیرہ۔ اس ضمن میں عبدالرزاق کانپوری کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جنہوں نے 'البرامکہ' اور 'نظام الملک طوسی' کتابیں تحقیق کے بعد لکھیں۔ ایک اہم خاندان اور شخصیت کے تاریخی کارناموں کو ابھارا۔

شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا، اس نے مسلمانوں کی تاریخ، اور ہندوستانی تاریخ دونوں پر کام کیا، مگر یہاں کے محققین اگرچہ فارسی و عربی کے عالم تھے اور بنیادی مآخذ تک ان کی پہنچ تھی، مگر وہ تاریخ نویسی میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں، اور جس طرح واقعات کا تجزیہ کیا جا رہا تھا، اس سے بے خبر رہے۔ انہوں نے اسلامی تاریخ میں بھی متنازعہ واقعات اور شخصیتوں پر نہ تو بحث کی، اور نہ رائے زنی کی، بلکہ محض واقعات کو بیان کر دیا۔

یہی صورت ہندوستان کی تاریخ میں رہی مثلاً 'بزم تیموریہ' اور 'بزم صوفیہ'، وغیرہ میں واقعات تو جمع کر دیئے ہیں مگر ان کا تجزیہ نہیں، اس وجہ سے ان کی تاریخ نویسی میں جان نہیں ہے، یہ محض واقعات کا مجموعہ ہیں، مگر کسی تفسیر اور تاویل سے محروم ہیں۔

پان اسلام ازم کے تحت جو تاریخ لکھی گئی، اگر اس کے پس منظر ذہنیت کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم اشرافیہ، ہندوستان میں سلاطین و مغل حکمراں اور ان کے کارناموں کو نظر انداز کر کے، دمشق، بغداد اور قرطبہ کی شان و شوکت کو ابھارنا چاہتے تھے۔ وہ اس ماضی میں پناہ لینا چاہتے تھے جو ان سے بہت دور تھا، مگر اس کی وسعت میں انہیں اپنی کم مائیگی کو ضم کرنے کا شوق تھا۔ اس ماضی کی شان و شوکت کا اظہار تاریخ کے علاوہ شاعروں اور ناول نگاروں

کے ہاں بھی ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سلاطین اور مغلوں کے ماضی کے کھنڈرات ان کے اردگرد تھے، ان کی زبوں حالی کے وہ شاہد تھے، اس کے زوال کا وہ خود شکار تھے، اس لئے انہوں نے شاندار اسلامی ماضی کی تشکیل کر کے اس میں پناہ لے لی۔ اس نے ان خیالات کو پیدا کیا کہ یورپ کی ترقی، مسلمانوں کی مرہون منت ہے، اندلس تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا کہ جس میں مذہبی رواداری کا رواج تھا، یورپ نے اہل اندلس سے تہذیب سیکھی، لہٰذا انہیں مسلمانوں کا احسان مند ہونا چاہئے۔ اس طرح انہوں نے ہندوستان میں مسلم حکمراں خاندانوں کی تاریخ اور ان کے تاریخی ورثہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہندوستان کی سیاست میں تبدیلی آئی، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کی ناکامی نے فرقہ واریت کو فروغ دیا، اس نے جہاں سیاست کو متاثر کیا وہیں تاریخ نویسی بھی اس کا شکار ہوئی، اب یہ اعتراضات کئے گئے کہ ہندوستان میں مسلمان حملہ آور تھے، اور سلاطین ومغلوں کا دور حکومت غیر ملکیوں کا تھا کہ جس کی وجہ سے ہندوستان کو نقصانات اٹھانا پڑے، تاریخ نویسی میں ان ہندو شخصیتوں کی تعریف وتوصیف کی گئی کہ جنہوں نے مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں سے مقابلے کئے تھے جیسے پرتھوی راج، رانا پرتاب اور شیواجی وغیرہ۔

اس کے جواب میں جو دلائل دیئے گئے، وہ یہ تھے کہ محمد بن قاسم، محمود غزنوی، اور محمد غوری مسلمانوں کے ہیرو تھے کہ جنہوں نے ہندوؤں کو شکستیں دیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ریاست قائم کی۔ جب اورنگ زیب پر اعتراضات کئے گئے تو شبلی نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی، لیکن شبلی کے دفاع میں کوئی تاریخی گہرائی نہیں ہے، ان کا استدلال بڑا سطحی ہے، مثلاً یہ جواب کہ اگر اورنگ زیب نے بھائیوں کو قتل کر دیا تو شاہجہاں نے بھی تو اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن ان کی اس کتاب نے اورنگ زیب کے حامیوں کو مطمئن ضرور کیا۔ اسی موقع پر پہلی مرتبہ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ مغلوں کے زوال کا ذمہ دار کون ہے؟ اکبر یا اورنگ زیب۔

محمود شیرانی نے اردو تاریخ نویسی میں سائنٹیفک اصولوں کو روشناس کرایا، اور اس پر زور دیا کہ واقعہ کی اصل کے لئے بنیادی ماخذوں کا مطالعہ، متن کو صحیح طور سے سمجھنا، اور سنہ یا تاریخ کے تسلسل کو دیکھنا ضروری ہے۔ اگرچہ انہوں نے کوئی تاریخ تو نہیں لکھی، مگر تنقیدی طور پر ان اعتراضات کا جواب دیا کہ جو محمود غزنوی اور فردوسی کے سلسلہ میں کئے جا رہے تھے، انہوں نے

ثابت کیا کہ محمود اور فردوسی کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ وہ اسے ہر شعر کے بدلے ایک اشرفی دے گا، یا وہ ہجو جو فردوسی سے منسوب ہے وہ اس کی نہیں ہے۔ انہوں نے ہم عصر مورخوں اور شعراء کے مآخذ سے یہ بھی ثابت کیا کہ محمود کے بت شکن ہونے کا واقعہ بھی تاریخی نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں نے 'پرتھوی راج رانا' کا بھرپور تجزیہ کیا، اور اس کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ لکھتے ہوئے انہوں نے تاریخ نویسی کے ان اصولوں کی پابندی کی۔ اس لحاظ سے وہ اردو تاریخ نویسی کے ایک اہم اور ممتاز مؤرخ ہیں۔

اردو تاریخ نویسی میں ایک اہم اضافہ صوفیاء اور علماء کی تاریخ کی تشکیل ہے۔ اب تک تاریخ کا دائرہ سیاست میں گھرا ہوا تھا، اس وجہ سے تاریخ کا مرکز حکمراں اور بادشاہ تھے، ان کو مرکز میں رکھ کر مورخ اس عہد کی تاریخ لکھتے تھے، لہٰذا ادب، موسیقی، آرٹ، فن تعمیر، اور فنون کو دربار کے تعلق سے لکھا جاتا تھا۔ یا پھر انتظام سلطنت اور معاشی صورت حال تھی کہ جسے بھی سیاست کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

چونکہ تاریخ نویسی کے رجحانات میں تبدیلی آرہی تھی، اس لئے ہندوستان میں فرقہ وارانہ حالات کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے کہ جس میں ہندو مسلم کش مکش، تصادم، اور تنازعہ کی جگہ ہم آہنگی اور اشتراک ہو۔ اس لئے مورخوں کو صوفیاء کے ہاں یہ رجحان ملا کہ انہوں نے مذاہب کا احترام کیا جس کی وجہ سے ان کی خانقاہیں، اور ان کی درگاہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے قابل احترام ہوگئیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس خیال کو بھی پھیلایا گیا کہ ہندوستان میں اسلام پھیلانے میں صوفیاء کا ہاتھ ہے، لہٰذا لوگ حکمرانوں کے جبر یا طاقت سے نہیں بلکہ صوفیاء کے رویوں سے مسلمان ہوئے۔ اس ضمن میں ان حقائق کو نہیں ابھارا گیا کہ جن میں صوفیاء اور ان کے مریدوں نے دعویٰ کیا کہ محمود غزنوی، محمد غوری، قطب الدین و التتمش وغیرہ کی فتوحات کے پس منظر میں صوفیاء کی دعائیں تھیں اور یہ کہ 'جہادی صوفیاء' بھی تھے کہ جو جنگوں میں حصہ لیتے تھے اور لڑتے تھے۔ صوفیاء کی تاریخ نویسی سے جو تصور مقبول ہوا وہ یہی تھا کہ یہ رواداری کے پیروکار تھے، اور مذہبی تعصبات سے بلند و بالا تھے۔ جس کی مثال ان کی درگاہوں پر ہونے والے عرس ہیں کہ جن میں ہر مذہب کے عقیدت مند برابر کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں کہ جب ہندوستان میں سیاسی تحریکیں ابھر رہی تھیں، وہیں علماء کا طبقہ سیاست میں آ چکا تھا، اور ہندوستان میں مسلمان کمیونٹی کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا، اس لئے انہیں بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ میں ان کے شاندار کردار کو ابھارا جائے۔ اس موقع پر دو شخصیتوں کو ماضی سے نکال کر حال کے مقاصد کے لئے باہر نکالا گیا ان میں سے ایک شیخ احمد سرہندی، اور دوسرے شاہ ولی اللہ تھے۔ اگر چہ ان دونوں حضرات کا اثر و رسوخ ان کے اپنے عہد میں بڑا محدود تھا، مگر موجودہ عہد میں ان کے کردار کو بہت زیادہ وسعت دی گئی۔

ابوالکلام آزاد جو تاریخ داں نہیں تھے، مگر انہوں نے شیخ احمد سرہندی کے بارے میں 'تذکرہ' میں یہ جملہ لکھ کر کہ انہوں نے اکیلے اکبر کے الحاد کا مقابلہ کیا، ایک بڑی تاریخی غلط فہمی کو پیدا کر دیا۔ فرقہ وارانہ سیاست کے اس ماحول میں کہ جس میں اکبر مشترکہ قومیت کی علامت تھا، وہاں احمد سرہندی کو اس کی مخالفت میں اسلامی شناخت کا علم بردار بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا مضمون 'الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ' قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کی بنیاد پر اکبر کو اسلام دشمن ثابت کر دیا، یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے تضاد میں احمد سرہندی کے کارنامے ابھریں۔ لہٰذا اردو تاریخ نویسی میں یہ دو کردار دو متضاد افکار کے ساتھ، اور دو متضاد سیاسی نظریات کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں، نتیجتاً فرقہ وارانہ سیاست میں اکبر کے ناقدین بڑھ گئے، جب کہ احمد سرہندی کے مورخین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

دوسری شخصیت شاہ ولی اللہ کی تھی، جب عبیداللہ سندھی کابل، وسط ایشیا اور روس کے دورے کے بعد واپس آئے تو انہیں مسلمانوں میں کسی سیاسی شخصیت کی تلاش تھی جسے وہ کارل مارکس کا درجہ دے سکیں۔ انہیں یہ شاہ ولی اللہ کی شکل میں مل گیا، انہوں نے 'شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک' میں انہیں ایک انقلابی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے ہاں مسلم امراء اور اشرافیہ کی زبوں حالی کا تجزیہ ضرور ہے، مگر وہ اپنی تجاویز کے باوجود اس طبقہ کو آگے بڑھانے میں ناکام رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی، مگر جب اس کی افواج دہلی میں تھیں، تو وہ خود اہم امراء کو خطوط لکھ رہے تھے کہ انہیں اور ان کے خاندان کو افغان فوجیوں سے بچایا جائے۔

اس کے ساتھ ہی علماء کے کارناموں کی تاریخ لکھی گئی تو ابتداء سید احمد شہید کی 'جہادی

تحریک' سے کی گئی، جعفر تھانیسری، مرزا حیرت، اور بعد میں غلام رسول مہر نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں، مگر یہ تمام کتابیں احتراماً اور تقدس کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ان میں تجزیہ نہیں کیا گیا۔ ان میں سرحد کے پٹھانوں کو موردالزام ٹھہرایا گیا ہے، لیکن مجاہدین کے عمل پر گرفت نہیں کی گئی کہ جنہوں نے اپنے زمانے میں طالبان قسم کی حکومت سرحد میں قائم کی تھی۔ مولانا محمد میاں کی کتاب 'علمائے ہند کا شاندار ماضی' میں انہوں نے علماء کے کردار کے بارے میں مواد جمع کیا ہے کہ جنہوں نے مختلف وقتوں میں تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اس تاریخ نویسی نے علماء میں اس احساس کو پیدا کیا کہ وہ ہمیشہ سے تاریخی تبدیلیوں میں شریک رہے ہیں، لہٰذا کولونیل ازم میں جب تحریکیں ابھریں، ان میں علماء کا طبقہ متحرک بن کر ابھرا۔

اردو تاریخ نویسی میں ایک اہم حصہ ریاستی تاریخوں کا ہے۔ خاص طور سے مسلمان ریاستیں کہ جہاں اردو سرکاری زبان تھی وہاں کے حکمراں اور اس کے خاندان کی تاریخ لکھی گئی، جو ریاست کی سرپرستی میں پوری ہوئی، اس لئے یہ تاریخیں اگرچہ ریاست کی تشکیل اور حکمراں خاندانوں کے بارے میں معلومات تو فراہم کرتی ہیں، مگر یہ محض واقعات کا بیان ہے، اس قسم کی تاریخ ٹونک، رامپور، حیدرآباد دکن، میسور، اور اودھ کی ریاستوں کی لکھی گئی ہیں۔ نجم الغنی خاں نے اودھ کی تاریخ لکھی، مگر شاید یہ انگریزوں کی خوشامد میں لکھی گئی، اس لئے اس میں اودھ کے حکمرانوں پر تنقید ہے، جس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ اس کا حکومت برطانیہ سے الحاق سودمند ہوا۔ اس کے علاوہ کشمیر، راجپوتانہ اور سندھ کی تاریخیں بھی لکھی گئیں۔ لیکن یہ بھی محض واقعاتی اور روایتی ہیں۔

اردو تاریخ نویسی میں کلچرل تاریخ کی روایت بھی ہے، اس کی سب سے بہترین مثال عبدالحلیم شرر کی کتاب ہے کہ جس میں لکھنو کے تمدن کی جھلکیاں ہیں۔ اودھ کی ریاست میں جو تہذیب و کلچر تشکیل ہوا تھا، اس کے نمونے اس کتاب میں ہیں۔ اسی روایت کو نصیرالدین ہاشمی نے دکن کلچر کی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ اودھ اور دکن کے دو کلچر، مغل کلچر کی پیداوار تھے، مگر یہ وہ کلچر تھا کہ جس کا تعلق اشرافیہ سے تھا، عام لوگوں سے نہیں۔

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد، یہ سوال پیدا ہوا کہ پاکستان کی تاریخ کو کہاں سے شروع کیا جائے؟ کیا قدیم ہندوستان کو اس کی تاریخ کا حصہ بنایا جائے یا اسے نکال

کر، اس کی شروعات عربوں کی فتح سندھ (۷۱۱ء تا ۱۲۰۰ء) سے کی جائے، اس سلسلہ میں کوئی نظریاتی طور پر تو کام نہیں ہوا، مگر یحییٰ امجد نے 'تاریخ پاکستان' کے نام سے دو جلدوں میں، موجودہ پاکستان کی قدیم تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اس میں پتھر کے زمانے سے لے کر، وادی سندھ کی تہذیب اور قدیم ہندوستان شامل ہے۔ ادریس صدیقی جو آثار قدیمہ میں ملازم تھے انہوں نے موہنجوداڑو پر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے حوالے سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ابنِ حنیف نے وادیٔ سندھ کی تہذیب پر جو تحقیق رفیق مغل نے کی تھی، اس کی روشنی میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اردو میں ان تحریروں کی وجہ سے وادیٔ سندھ کی تہذیب اور اس کی تاریخ کے بارے میں ایک حد تک کافی مواد ملا ہے۔ مگر ان تینوں مصنفوں نے نظریاتی طور پر اس سلسلہ میں کوئی بحث نہیں کی کہ کیا پاکستان کی تاریخ کو اس تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

کیونکہ جو لوگ پاکستان کو مذہبی نیشنل ازم کے حوالے سے دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک اسلام سے قبل کی تاریخ پر تحقیق یا مطالعہ فضول ہے، کیونکہ قبل از اسلام کی تاریخ مسلمانوں میں کوئی مذہبی شعور پیدا نہیں کرے گی، اور نہ ہی وہ اس سے کچھ سیکھیں گے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت شیخ محمد اکرام نے تین اہم کتابیں 'آبِ کوثر'، 'رودِ کوثر' اور 'موجِ کوثر' لکھیں، ان کے موضوعات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ 'اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور روحانی تاریخ' ان تینوں کتابوں میں شیخ محمد اکرام نے سیاسی تاریخ کو پس منظر میں رکھتے ہوئے، صوفیاء اور علماء کے تاریخی کردار کو ابھارا ہے، جس سے آخر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان معاشرہ، ہندو معاشرہ سے علیٰحدہ اپنا وجود رکھتا تھا اور اس معاشرہ کی مذہبی شناخت کو علماء نے برقرار رکھا جب کہ صوفیاء نے ان کی روحانی تربیت کی۔

اردو تاریخ نویسی میں اہم اضافہ فارسی کے بنیادی مآخذ کا ترجمہ ہے۔ یہ تراجم تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں کئے گئے تھے بعض تراجم انفرادی طور پر ہوئے، پاکستان میں اردو مرکز لاہور نے اور مجلس ترقی ادب نے سلطنت اور مغل دور کے مآخذ کے تراجم کرائے جو بہت معیاری ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ نے ابتداء میں کچھ تراجم سندھ کی تاریخ پر فارسی مآخذ کے اردو میں کرائے جیسے چچ نامہ، یا تاریخ معصومی، مگر اب ان اداروں میں مزید ترجموں کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ اس لئے اردو داں طبقے کو جو سہولت ملی تھی، وہ ادھوری رہی۔ ہندوستان میں

ساہتہ اکیڈمی اور فروغِ اردو اکیڈمی نے تاریخ کی کلاسیکل کتابوں کے ترجمہ کرائے، جن میں کومبی، ایشوری پرشاد، بینی پرشاد، سکسینہ، کے ایس لال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ ابتدائی تحقیقی مواد اردو داں طبقے تک پہنچ گیا۔

یہاں میں پاکستان میں تاریخ کی ان نصاب کی کتابوں کا ضرور ذکر کروں گا جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔ پاکستان کے قیام کے وقت جو نصاب کی کتابیں لکھی گئیں، ان میں قدیم ہندوستان کے بارے میں پوری معلومات دی جاتی تھیں، لیکن جب ۱۹۶۰ء کی تعلیمی پالیسی کے بعد سماجی علوم کو روشناس کرایا گیا اس میں تاریخ کو اس کا ایک حصہ بنا دیا گیا، جس کی وجہ سے تاریخ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اب قدیم ہندوستان کو نصاب سے نکال دیا گیا ہے، اور زیادہ حصہ تحریکِ پاکستان پر ہے۔ تحریکِ پاکستان کو دو قومی نظریہ، اور شخصیتوں کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور سے مسلم شناخت کو ابھارنے کی خاطر ہندوؤں کے خلاف مواد کو شامل کیا گیا ہے جس نے تاریخ کو فرقہ وارانہ بنا دیا ہے۔

کالجوں میں جو تاریخ کا نصاب ہے، اس میں بھی قدیم ہندوستان نہیں ہے اردو میں جو نصاب کی کتابیں ہیں وہ انتہائی غیر معیاری ہیں، کیونکہ یہ پروفیشنل مورخوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں، نہ ہی ان میں جدید تحقیق کے نتائج کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ روایتی انداز میں لکھی گئی ہیں، جو دیکھا جائے تو ان میں مسخ شدہ تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔

جب طالب علم اسکولوں اور کالجوں میں ان کتابوں کو پڑھتے ہیں، تو اس کے نتیجہ میں ان کے ذہنوں میں ہندوستانی مشترک تہذیب کے بجائے جداگانہ کلچر کا تصور اُبھرتا ہے، جس نے نہ صرف ہندو اور مسلمان کمیونٹیز کو تقسیم کیا بلکہ برصغیر کو بھی بانٹ دیا۔

ہندوستان اور پاکستان کے مورخوں کے درمیان کئی بار اس مسئلہ کو اٹھایا گیا کہ اس صورت حال میں ایسی نصابی کتابوں، اور عام قارئین کے لئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے کہ جو دونوں جانب کے مورخ آپس میں بیٹھ کر اور مل کر لکھیں، اور جو تاریخی غلط فہمیاں دونوں ملکوں اور ان کے سماجوں میں ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ ہم 'تہذیبوں کے تصادم' کے بجائے تہذیبوں کے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی کو دیکھیں۔ ایسی تحریروں کی اردو اور ہندی میں ضرورت ہے تاکہ یہ عام لوگوں تک پہنچ سکے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فنِ تاریخ نگاری

ظہیر الدین ملک

اٹھارہویں صدی کے دوران تاریخی مضامین عام علمی تربیت کا ایک لازمی جُز تھے۔ گو تاریخ کو اعلیٰ تعلیم کے نظام میں باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا، لیکن فطرتِ انسانی سے تعلق رکھنے والے مضامین پر اس کا بڑا اثر تھا۔ کیونکہ اس کا مطالعہ ذہن کے لئے بڑا محرک ثابت ہوتا تھا[1] چنانچہ اس دور میں مورّخین نے بہت کچھ لکھا۔ باقاعدہ سیاسی تاریخوں کے علاوہ بہت سے انتظامی رسالے نیز کاروبار اور تجارت پر کتابیں تالیف کی گئیں[2] دستاویزوں میں دلچسپی کے باعث بہت سے مکتوبات اور تاریخی اہمیت کے دیگر مجموعے تالیف کئے گئے[3] یہاں تک کہ مورّخین نے صنفِ نظم کو بھی نہ چھوڑا اور منظوم تاریخیں بڑی تعداد میں لکھی گئیں[4] اس ادب کے علاوہ امیروں اور صوفیوں کی سوانحیں اس دور کی عظیم الشان اور فاضلانہ دین ہیں۔[5] اہم ترین چیز، جس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی خاص طور سے باعثِ دلچسپی بن گئی، وہ عظیم مذہبی ادب ہے جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تصوّف پر نامی گرامی کتابیں شامل ہیں۔[6] سماجی زندگی کے مختلف پہلو اور تہذیب کے مختلف رُخ سمجھنے کے لئے شاعروں کے دیوانوں اور تذکروں سے بڑی مفید معلومات ملتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی تحریریں تنوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑی پُر اثر ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے شاید کسی اور دور میں مذہبی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر اتنا زیادہ ادب تیار نہیں ہوا جتنا اٹھارہویں صدی میں ہوا۔[7]

زیرِ نظر دور میں مورّخین کا خاص موضوع سیاست تھا، اور غیر مذہبی انداز کے مضامین کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ اپنی کتابوں میں فوجی مہموں، میدانِ جنگ کے کارناموں اور شاہی دربار کی رنگا رنگ سرگرمیوں پر خاصہ وقت صرف کرتے تھے۔ انتظامی کام، افعالِ جود و کرم نیز فن

اورادب کی سرپرستی کی تفصیلات بھی ان کے لئے جاذبِ توجہ تھیں۔

خفی خاں نے سرتاپا ایک سیاسی تاریخ لکھی، اور معلومات فراہم کرنے کے لئے وہ دربارِ شاہی کے چکّر کاٹتا رہا۔ اس کی کتاب واقعات کی ایک نمایاں تخلیقِ نو ہے، جو اسلوبِ بیان کے اعتبار سے واضح اور تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے بڑی منظم ہے۔ اسے واقعات کا بڑا علم ہے، اور اس کے پاس موضوعات بھی بہت ہیں۔ مغل تاریخ کے تسلسل کی بابت اس کا ایک تصور ہے اس کے علم وفضل کے علاوہ، اس کی ترتیبِ الفاظ اور اظہارِ بیان میں غیر معمولی حسن ہے۔ واقعات کو ایک وسیع سیاق سے وابستہ کرنے اور ماضی سے اسی انداز اور اسی قسم کی مثالیں دینے کا اسے ملکہ ہے۔ شاید وہی اکیلا مصنف ہے جو مختلف زبانوں میں کی جانے والی ان اصلاحات کا ایک جامع اور مربوط بیان دیتا ہے، جو اصلاحات منصب داری نظام کو ازسرِ نو منظّم کرنے کے لئے کی گئی تھیں، جو نظام اپنے ہی وسیع ڈھانچے کے بوجھ تلے دَب کر ٹوٹ رہا تھا۔[8] مرکزی انتظامیہ، مرہٹوں کے معاملات اور جاگیرداروں کی حالت پر اس کی تحریریں بے مثل ہیں۔ ان میں نہ صرف نئی معلومات شامل ہے، بلکہ اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان معاملات پر مصنف کی کتنی گہری نظر تھی۔

بہادر شاہ کے دور میں مغل انتظامیہ کے اندر زوال کا جو عمل شروع ہو گیا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے کہ:

> ہندوستان میں تیموری حکومت کے قیام کے بعد سے ایک خطاب دو اشخاص کو نہیں دیا گیا، ہاں ایک دو صروف کے ردّ و بدل کی اجازت تھی۔ صفدر خاں بابی، جو اورنگ آباد میں تعینات تھا، اورنگ زیب کے زمانے سے ایک موروثی خطاب کا مالک تھا۔ لیکن بہادر شاہ نے یہی خطاب اپنے ایک پُرانے ملازم کو عطا کر دیا۔ صفدر خاں نے اس خطاب کو برقرار رکھے جانے کی عرضداشت پیش کی جو اس سے بنا کسی نافرمانی کے چھن گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی درخواست پر عطا کیا، عطا کیا، عطا کیا، لکھ دیا۔ حالانکہ وہی خطاب پہلے ہی ایک دوسرے شخص کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اسی دن سے یہ بُرا رواج بن گیا کہ ایک ہی خطاب دو یا تین اشخاص کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح، منصب، ہاتھی، جیغا؟ اور سرپیچ کی بخشش پانے والے کے رُتبے

اور وقار کے مطابق نہیں کی جاتی۔[9]

افسرانِ خزانہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ انتظامِ مال تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور انہوں نے ایسی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جن کے ذریعے منصب داری نظام کو معیاری اور اثر آفریں بنایا جا سکے۔ انہیں توقع تھی کہ اصلاح کے بعد یہ نظام اس صورتِ حال پر قابو پالے گا۔ جس میں خرچہ آمدنی سے بڑھ گیا تھا، اور شہنشاہ بے سوچے سمجھے جاگیریں عطا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس مقصد کے لئے زمینیں کم تھیں۔ اخلاص خاں، ارضِ مکرر، جو اپنی دیانت داری اور محنت کی وجہ سے مشہور تھا، اس نے منعم خاں وزیر کی توجہ اس مالی بحران کی طرف مبذول کرائی جو ان مسائل کے باعث پیدا ہوا تھا۔[10] اس نے مشورہ دیا کہ منظوری سے پہلے تقرّری یا ترقی کے لئے دی جانے والی درخواست کی جانچ پڑتال پہلے وزیر خود کرے۔

یہ یقینی تھا کہ اس انداز کی اصلاح کی مخالفت دربار کے وہ لوگ کریں گے جن کے حقوق اور اختیارات پر چوٹ پڑتی ہوگی۔ منعم خاں نے اس ڈر سے کہ عہدوں کے متلاشی لوگوں میں اس کی مقبولیت کم ہو جائے گی، یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا منظور نہ کیا اور اخلاص خاں سے کہا کہ اصلاح کا کام خود کرے۔ اخلاص خاں کو جب اپنے سے اعلیٰ عہدیدار کی مدد اور اشتراک نہ ملا تو اسے لگا کہ یہ کام اس کے قابو سے باہر ہے۔ اس نے خود بھی ان اشخاص کے جذبات کو روندنے سے انکار کر دیا جو حکومت میں مرتبے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔

آخر میں ہر منصب دار کی ابتدا، منصب اور وقار کی تفتیش کا کام مستعد خاں کے سُپرد کیا گیا، جو 'معاصرِ عالمگیری' کا مصنف تھا۔ اس سے پہلے کہ ارضِ مکرر اور وزیر منصب داروں کی درخواستیں آخری منظوری کے لئے شہنشاہ کو بھیجیں، مستعد خاں کو یہ ساری درخواستیں جانچنا اور تصدیق کرنا ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ اصلاح کا یہ منصوبہ نہ صرف ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ناکام ہوا جو دولت کے متلاشی تھے بلکہ بہادر شاہ کی بے تکلفی کی وجہ سے بھی ہوا۔ امیدواروں کی جو درخواستیں مستعد خاں کے سامنے پیش ہونے سے پہلے شہنشاہ کی دو بیگمات، مہر پرور اور امتہ الحبیب شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیتی تھیں وہ ان پر دستخط کر دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کے دستخطوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ عالی جاہ اپنے افسروں سے کہتے کہ ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا راستہ نہیں رہ گیا کہ ہر امیدوار کے لئے جاگیر عطا کرنے کا فرمان جاری

کردیں۔اس کے افسران بہرحال، آزاد تھے کہ موقع کی مناسبت سے جو بہتر سمجھیں وہ کریں۔'[11]

مقامی سطح پر انتظام مال کی بابت خفی خاں کا علم معتبر لگتا ہے، کیونکہ تحصیل وحصول کا معاملہ اس کے عملی تجربے پر مبنی تھا۔ وہ عامل کی حیثیت سے خاصے عرصے تک حکومت کا ملازم رہا، حالانکہ وہ اس عہدے سے سخت متنفر تھا۔ وہ عاملوں کو بدخُو، بدکردار اور ظالم کہتا ہے۔ افسر مالِ حکومت کی رقم پر ناجائز تصرف کرتا ہے اور مجبور کاشتکاروں کو لوٹتا ہے۔ مصنف خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کسانوں پر ظلم کیا اور مسلمانوں کی جائیداد واملاک تباہ کی۔ اس کے نزدیک کُتے ہانکنا اور سُوّر چَرانا تحصیل وصول سے بہتر کام ہیں۔[12]

افسرانِ مال کی زیادتیوں پر لعنت بھیجنے کے علاوہ، خفی خاں دوسروں افسروں کو بھی موردِ الزام ٹھہراتا ہے، جنھوں نے بگڑتی ہوئی سیاسی صورتِ حال پر، کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے پر، نئی آبادیاں بسانے پر، اور زمینوں سے آمدنی بڑھانے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں اجارہ داری یا زراعت برائے آمدنی کی وہ لعنتیں بتائی ہیں کہ جن کی وجہ سے رعیت پریشانی میں مبتلا ہو کر مٹی میں مل گئی اور دیہات ویران ہو گئے۔ وہ بڑے تیکھے انداز میں امیروں پر تنقید کرتا ہے جو ضرورت مندوں کی ذرا مدد نہیں کرتے، بس اپنی ذات میں محبوس رہتے ہیں اور عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔[13]

انتظامی تفصیلات نیز کاروبار اور تجارت کے بیانات پر مشتمل ایک کتاب 'مرات الحقائق' ہے۔[14] اس کا مصنف اعتماد علی خاں بن اعتماد خاں عالمگیری، احمد آباد کا باشندہ تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ یہ ضخیم کتاب 'مراتِ احمدی' کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ روزمرّہ کے ان واقعات اور خبروں کی بیاض ہے جن کا تعلق گجرات اور دارالسلطنت دہلی سے تھا۔ یہ کتاب ایسی تفصیلات کی ایک کان ہے جن کا تعلق ملک کے مختلف حصوں میں رائج قیمتوں سے، اور بعد کے مغلوں کے دور میں حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے ہے۔ 'مراتِ احمدی' کے برعکس، اس کتاب میں نہ صرف گجرات کے اقتصادی حالات کا ذکر ہے، بلکہ دہلی، آگرہ اور الٰہ آباد کا ذکر بھی ہے۔ اس کا مصنف مختلف ابواب میں ان اسباب کی تشریح کرتا ہے جن کے باعث منصب داری نظام ٹوٹ گیا۔ ان منصب داروں کے حالات کا بڑی وضاحت کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے جن کے پاس یا تو جاگیریں نہ تھیں یا جو اپنی زمینوں پر اپنا اختیار قائم نہ رکھ سکے۔

اس دور کے مورّخین کو خیال تھا کہ وقت کی راہِ سفر چند منتخب لوگوں کی تعریف وستائش کر کے اور ان کی تصویروں پر مبالغے کی رنگ آمیزی کر کے بیان کی جاسکتی تھی۔ اُن کے نزدیک قفلِ تاریخ کی کنجی اُن افراد کے عروج وزوال میں پوشیدہ تھی جنہوں نے سیاسی معاملات کی راہ متعین کرنے میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا۔ بادشاہ یا امیر سارے واقعات کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ سماج کے مختلف طبقے وقت کے اندھیرے میں پھینک دیئے گئے تھے۔ حالانکہ یہ محققین مغل تمدن کی مادی بنیاد سے خوب اچھی طرح واقف تھے، پھر بھی یہ ان اقتصادی اور سماجی عنصروں کا تجزیہ نہ کر سکے جو مغل انحطاط کے اسباب میں شامل تھے۔

مغل قوت کے زوال کی تشریح کرتے وقت ان مورّخین نے عام طور پر ان چند امرا کی اخلاقی اور سماجی پستی پر زور دیا جو کاہل اور مطمئن بالذات ہو گئے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتتے تھے۔ مثال کے طور پر، 'شاہ نامہ دکن' کا مصنف احسن ایجاد[14] طبقہء امرا کے کردار پر تنقید کرتا ہے اور اس کے زوال کا تعلق سیاسی قوت کے انحطاط سے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ 'شاہ نامہ دکن' میں انتظامیہ اور جنگوں کے بارے میں اس کا بیان گوسرسری ہے لیکن بے لاگ اور دُرست ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی بداطواری اور عیش پسندانہ زندگی پر، امرا کی گٹھ بندی اور رقابت پر، اور مغل حکومت کے دُشمنوں سے نپٹتے وقت ان کے بُزدلانہ برتاؤ پر طیش میں آجاتا ہے۔ وہ سپاہیوں، چھوٹے منصب داروں اور کم تنخواہ والے ملازموں کی مفلسی اور مصائب کی بھیانک تصویر پیش کرتا ہے، اور وہ باعزت اور تعلیم یافتہ لوگ اس تصویر میں شامل ہیں جو اپنی روزی کے واسطے حکومت کی سرپرستی پر تکیہ کرتے تھے۔

جب مرہٹوں نے دو اہم اور زرخیز صوبوں، گجرات اور مالوہ پر قبضہ کر لیا، تو تحصیل وصول کرنے والے چھوٹے افسران اور ملازمین کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہو گئی۔ سیاسی مسائل پر بحث کرتے وقت احسن ایجاد مرہٹوں اور اندرونِ سلطنت دوسری تفرقہ انگیز قوتوں کے خلاف ایک نمایاں اور موثر حکمتِ عملی کی حمایت کرتا ہے۔ دوسرے مصنفین کی طرح، یہ بھی راجہ جے سنگھ کے رول پر ملامت کرتا ہے جس نے مرہٹوں کی بات مان لی، اور جو خاصے وسائل کے باوجود شاہی مقبوضات کو مرہٹوں کی یورشوں سے بچانے میں ناکام رہا۔

لیکن سیاسی، سماجی، اقتصادی قسم کے پیچیدہ مسائل کا اس نے جو تجزیہ کیا ہے اس تجزیے

میں بصیرت اور گہرائی کم ہے۔ جو کچھ گزرا اس کے اسباب وہ بڑی سادگی سے دے دیتا ہے، لیکن اس کی تفتیش سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جو تاریخی عمل رونما ہوئے ان کے پیچھے کیا مقصد تھا یا کیا معقولیت تھی۔ وہ کاشتکاروں کی حالت پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہے اور ان بُرائیوں کی تشریح نہیں کرتا جو مغلوں کے فوجی نظام میں داخل ہوگئی تھیں۔

چونکہ یہ زمانہ سیاسی انحطاط اور اقتصادی پریشانی کا زمانہ تھا، اس لئے تاریخ کی ساری عصری تحریروں پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس دور کے مورّخ شاذ و نادر ہی ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو خطیبانہ اور آراستہ پیراستہ ہو۔ وضاحت اور سادگی اس مقصد کے حصول میں ان کی مدد کر سکتے تھے جو اُن کے ذہن میں تھا۔ اُن کا تصورِ تاریخ ان اخلاقی نصیحتوں پر مبنی تھا جس نے لوگوں کی تہذیب اور نظریات پر اثر ڈالا تھا۔ یہ مورّخین ماضی سے منتخب کر کے ایسی مثالیں دینا پسند کرتے تھے جن کا مقابلہ اس صورتِ حال سے کیا جا سکے جس کا سامنا بادشاہ اور امرا کر رہے تھے۔ واقعاتِ ماضی سے اخذ کئے ہوئے اخلاقی مضامین سب شاہوں اور سیاسی مدبروں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔[16] وہ تاریخ کی تشریح اس انداز سے کرنا چاہتے تھے جیسے تاریخ نیک و بد کے درمیان ہونے والی کشمکش ہو۔ یہ گویا فلسفہ بالمثال کی تدریس تھی، کیونکہ جن لوگوں نے انصاف اور عوامی بہبود کے بنیادی اصولوں کی پیروی کی انہیں قوت اور ترقی ملی، اور جو لوگ اس راہِ مستقیم سے بھٹک گئے انہیں اذیت اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

بیشتر مورّخوں نے اپنے زمانے کے واقعات خاص طور پر تحریر کئے۔ وہ یا تو دربارِ شاہی کے حاضر باش تھے یا پھر دارالسلطنت میں رہنے والے وزرا کے ملازم تھے۔ ان میں چند مورّخ دُور افتادہ صوبوں کے عہدیداروں اور صوبیداروں کے بھی ملازم تھے۔ اس طرح ان کے پاس وہ عمدہ ذرائع موجود تھے جن کی مدد سے مختلف واقعات کی بابت مناسب اور دُرست معلومات حاصل کر سکیں۔ جن واقعات کا انہیں براہِ راست طور سے علم نہ تھا، ان کی بابت ان لوگوں سے معلومات حاصل کی جو عینی شاہد تھے۔ 'تاریخِ ارادت خاں' کا مصنف، ارادت خاں، اورنگ زیب کے زمانے میں پہلے جگنا کا اور پھر اورنگ آباد کا اور مانڈو کا فوجدار رہا۔ بعد میں شاہ عالم بہادر شاہ کے دور میں اسے دوآب کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے:

اپنے عہد کے سبب، اور چونکہ میں خود ان معاملات میں شامل رہا ہوں۔

اس لئے بیشتر واقعات کے ذرائع کا مجھے مکمل علم ہو گیا ہے، اور جن واقعات کی اطلاع بھی دوسروں کو بڑی مشکل سے ملے گی، ان کے منصوبے میرے سامنے بنے اور ان پر میری نظروں کے سامنے عمل درآمد ہوا۔ اور چونکہ میں سارے خطروں اور مصیبتوں میں شریک رہا اور دیکھتا رہا، اس لئے میں نے انہیں درج کرلیا۔ [17]

ان مورّخوں کے پاس جو تاریخی مواد موجود تھا اسے تحریر کرتے وقت انہیں اپنے سے پیشتر کے مورّخین کی کتابوں سے بڑی ہدایت ملی۔ سابق مورّخین کی کتابیں بڑی تعداد میں ان مورّخین کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ خفی خاں سچائی کا چونکہ پُر جوش حامی تھا اس لئے اس نے زور دیا کہ ہر شہادت کی مکمل تحقیق کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر مورّخ کا یہ فرض ہے کہ وہ حقائق کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ تحریر کرے' اسے (مورّخ کو) یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک کا پاس کرے اور دوسرے سے دُشمنی۔' [18] 'مراتِ وریدات' کا مصنف، شفیع وربد، دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے وہ واقعات اور حادثات تحریر کئے ہیں جو یا تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا دوسروں سے سُنے۔ اس نے بڑی کاوش سے دوسروں کے بیانات کی تفتیش کی اور جو بیانات پوری اور گہری چھان بین کے بعد غلط ثابت ہوئے انہیں رد کر دیا۔ [19]

ان مورّخین نے جن طریقوں سے مواد اکٹھا کیا وہ طریقے عام طور پر دوسروں سے مختلف اور ان کے اپنے طریقے تھے، اور ہر چند کہ حقائق ایک ہی تھے لیکن ان کی ترجمانی مختلف تھی۔ یہ اختلافات مختلف صورتِ حال، مختلف سماجی پس منظر اور مختلف سیاسی مفاد کے باعث رونما ہوئے درباریوں اور امیروں کے گروہی جھگڑوں میں وہ کسی نہ کسی فریق سے وابستہ ہو گئے۔ اپنے سرپرستوں کے مفاد سے وابستہ ہو جانے کے سبب اُن کا اندازِ فکر متاثر ہو گیا۔ لہٰذا سیاسی قوتوں کے جوڑ توڑ کے بارے میں ان کی تشریحات اسی عنصر داخلیت سے متاثر ہو گئیں۔

ان سب مصنفین کا عقیدہ یہ تھا کہ تاجِ مغل ایک مقدس ادارہ تھا، جو ملک پر ہمیشہ حکومت کرنے کے لئے مقدر ہو چکا تھا، اور اسی بنا پر وہ حکمراں طبقے کی قوت اور استحکام کی علامت تھا، اور زمانہ سازوں نیز قوت فروشوں کی غارت گری سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی آخری ڈھال تھا۔ لیکن جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں، اس دور میں بادشاہ کی حیثیت گروہی سیاست کی بساط پر

گھٹ کر ایک بے زور پیدل کی سی ہوگئی تھی۔ فرخ سیر کی معزولی اور وفات نے دکھا دیا کہ بالآخر وزیروں اور امیروں کو شہنشاہ پر فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے مغل تاج داروں کو فن حکومت کی پوری تعلیم نہ ملی تھی۔ وہ اس خطرناک بحران کا مقابلہ نہ کر سکے جس سے مغل حکومت برابر دوچار رہی۔

جن عصری مصنفین نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ سلطنت ملکی جھگڑوں کا شکار ہو رہی ہے، اور اس کا عظیم ڈھانچہ بغاوتوں اور باہری حملوں کی لہروں کا سامنا کرتے کرتے بالآخر ٹوٹ رہا ہے، انہوں نے شہنشاہوں کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں اور ان کے بُرے ملکی انتظام پر لعنت ملامت کرتے وقت جھجک سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے فوجی مہموں اور ملکی انتظام کے بارے میں بادشاہوں کے نامناسب اور بے موقع اقدامات پر کھلم کھلا تنقید کی۔ حتیٰ کہ ان معاملات پر بھی سخت تنقید کی جن کا تعلق ان کی نجی زندگی سے تھا۔ بہادر شاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مستحق اشخاص کو قوت و اقتدار کے عہدے اور تحائف دینے میں بڑی فیاضی برتتا ہے۔[20] جہاں دار شاہ کو ایک اوباش شرابی کی تصویر میں پیش کیا گیا۔[21] اور فرخ سیر کو تلون کا غلام کہا گیا۔[22] محمد شاہ پر یہ الزام لگایا کہ آرام طلبی اور بے اعتدالی کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں رہ گیا کہ مطلبی امرا کو قابو میں رکھ سکے۔[23]

اس کے باوجود مورّخین کو امرا کا کوئی ایسا کام برداشت نہ تھا جسے نافرمانی کہا جا سکے۔ انہوں نے ان مقامی قائدوں کے خلاف کھل کر اپنی خفگی کا اظہار کیا ہے جنہوں نے اپنی قوت کے بل بُوتے پر ان قوائد میں حصہ بٹانا چاہا جو سلطنت کے نام پر انہیں حاصل ہو سکتے تھے۔[24] مرکز اور صوبوں کے درمیان ہونے والی برتری کی جدوجہد میں مورّخین دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ مورّخین مرکزِ سلطنت کے پُرجوش حامی ہیں اور کچھ دوسرے مورّخین مقامی سرداروں اور صوبیداروں کی حمایت کرتے ہیں۔ جن مورّخین نے اپنی تاریخیں دکن میں تالیف کی ہیں جیسے قاسم اورنگ آبادی، 'معاصر نظامی' کا مصنف، منسا رام، 'تاریخ فتحیہ' کا مصنف، یوسف محمد خاں، نیز کچھ اور مورّخین، انہوں نے مرکز سے تصادم کے معاملے میں نظام الملک کی حمایت کی۔ لیکن آشوب، رستم علی، شفیع جاوید، مرزا محمد جیسے مصنفین نے مرکزی نقطۂ نظر کی تائید کی۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ وہ تاجِ مغل کے وفادار تھے، اس شخص کے نہیں جو اسے پہنتا تھا۔

حکمراں طبقے نے ذہنی تھکاوٹ اور تخلیقی قوت کی کمی کا اظہار کیا۔ شاہانِ مغلیہ کی خدمت کے پُرانے جذبے کی جگہ ریاست کے خودغرضانہ استحصال نے لے لی۔ بڑے بڑے امرا نے

سارے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر قبضہ کرلیا، بڑی بڑی زمینیں جاگیروں کی شکل میں اپنالیں اور شاہی قوت کی جڑ کاٹ دی۔[۲۵] چھوٹے منصب دار ذِلّت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے لگے۔[۲۶] امرا کا ایک نیا طبقہ، جو خاندان یا لیاقت کی بنیاد پر کوئی حقوق طلب نہ کرسکتا تھا، عروج پاکر قوت اور امتیاز کے مقامات پر پہنچ گیا۔[۲۷] جتھے بند اور بداطوار امرا وقت کی چنوتیوں کا سامنا کرنے میں سخت ناکام رہے۔ سماج کے وہ منتخب حضرات جو سیاسی ذہن رکھتے تھے غفلت کی نیند سوتے رہے اور پورے دور حالتِ جمود میں رہے۔ ان کا ذہن مریض، نظر کوتاہ اور اخلاقی کیفیت برباد ہوگئی اور پورے طبقے کی ساری انفرادیت ختم سی ہوگئی۔ طبقہ امرا کا گروہوں میں تقسیم ہو جانا، عوام سے علیحدگی اختیار کرلینا، اور فلاحِ عام سے لاپرواہی برتنا، ان سب باتوں کی وجہ سے پورے طبقہء امرا کے زوال کے واسطے زمین ہموار ہوگئی۔

طبقہ امرا کے اس تنزل کو عصری مصنفین نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور بعض اوقات بڑی سخت زبان استعمال کی ہے۔ مرہٹوں کے معاملات پر بحث کرتے وقت، شفیع وریدتحریر کرتا ہے کہ صوبہء آگرہ میں پانچ سے سات ہزار ایسے منصب دار رہتے تھے جن کے پاس بڑی فوجیں تھیں۔ اسی علاقے میں بہت بڑی تعداد ایسے زمینداروں کی تھی جن کے پاس خاصے لوگ اور ساز وسامان تھا۔ لیکن یہ سارے منصب دار اور زمیندار صوبہء آگرہ کے گاؤں اور شہروں کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہ بچا سکے۔[۲۸] 'حدیقۂ نادرشاہ' کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> حکومت کے معاملات بگاڑ دیئے گئے تھے۔ شہنشاہ کے وزیروں نے، جیسے قمرالدین خاں اور خانِ دوراں جو اعلیٰ مرتبوں اور دولت کی فراوانی کے باعث غرور کے نشے میں چُور تھے، حکومت کے معاملات کو نظر انداز کیا تھا۔ وہ آرام طلب تھے، کوئی ان کی عزت نہ کرتا تھا۔ نہ خود وہ بادشاہ سے خائف تھے، اور بُرے کاموں میں ملوث رہنے کے علاوہ ان کا کوئی کام نہ تھا۔[۲۹]

ایک ایسے ماحول میں جو گروہی جھگڑوں سے پُر تھا، مورّخین مجبور ہوگئے کہ اپنے گروہ کے فائدوں پر نظر رکھیں، اپنے سرپرستوں کی طرف داری کریں اور ان کے دعوؤں کی تائید کریں۔ اس جانبدارانہ سیاست نے ان کا صحیح ادراک ختم کردیا اور ان کے اُفق خیالات پر پردہ ڈال دیا۔

تاریخ کا کینوس سمٹ کر اس معمولی مباحثے تک محدود ہو گیا کہ حکمراں جماعت میں کون سا گروہ کس شخص یا گروہ کے ساتھ ہے۔ اس مباحثے کا پوری سماجی زندگی کے وسیع تر پہلوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ گھٹ کر محض مجموعۂ حقائق بن گئی جس کو سیاسی رسالوں کی طرح پڑھا جاتا اور اُسے امرا کے کسی ایک گروہ کے مفاد میں حکمراں طبقے کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف ایک موثر حربے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ حق کی چھان بین اور تاریخی مواد کی فراہمی اور استعمال کی اہمیت سمجھنے کے واسطے جس تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں کم تھا۔

اس مشاہدے کی وضاحت کے لئے تین مخصوص مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ نزاعی مسائل کی ترجمانی کتنے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ یہ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

(i) فرخ سیر اور سیّد برادران کے درمیان تصادم

(ii) مغلوں اور سادات برہا کے درمیان حصولِ قوت کے واسطے مقابلہ

(iii) ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے کے وقت مختلف امرا کا رول

ان مخصوص مسائل کا تنقیدی مطالعہ ہمیں یہ طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے کہ ہمعصر مورّخین کے ذہن کن تعصّبات سے متاثر ہوئے۔

(i) فرخ سیر اور سید برادران کے درمیان جو طویل تصادم ہوا، اس کے باعث شاہی دربار پر تقریباً مستقل خوف اور بے چینی چھائی رہی۔ اپنی بقا کے واسطے سخت مقابلے میں مصروف رہنے کے باعث شہنشاہ اور اس کے وزیروں نے ملکی انتظام کی طرف توجہ نہ دی اور ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بنانے میں منہمک رہے۔[۳۰] ہوشیاری اور استقلال کی مِلی جُلی حکمت عملی کی بنا پر سید برادران نے اپنا اثر قائم کر لیا اور سارے معاملات کو پورے طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اٹھارہویں صدی کے مورّخین جب ان عظیم واقعات کو تحریر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انتخابِ حقائق اور ان کی ترجمانی کے معاملے میں ان کے رویّے جُدا جُدا ہیں۔ مصنفین کی ایک جماعت سید برادران کے بُرے کاموں پر سخت تنقید کرتی ہے، اور اس کے برعکس بعض دوسرے مصنفین حکومت کی ساری بُرائیوں کی مکمل ذمہ داری فرخ سیر کے کاندھوں پر ڈالتے ہیں۔ سید برادران کی نافرمانیوں کے باعث، نیز حصولِ قوت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور انتظامی فرائض

کی ادائیگی سے لاپرواہی کے باعث، اُن کا ذکر بڑی حقارت سے کیا جاتا ہے۔[۳۱] اسی طرح فرخ سیر پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنے طاقتور وزیروں سے نپٹتے وقت اس نے کمزور اور ناپائیدار حکمت عملی اپنائی۔[۳۲]

خفی خاں واضح طور پر یہ لکھتا ہے کہ سید عبداللہ اور حسین علی کو اعلیٰ فوجی اور مالی عہدے دے کر فرخ سیر نے سخت غلطی کی کیونکہ ان دونوں کو انتظامی امور کی نہ کوئی تربیت ملی تھی نہ اس کا انہیں تجربہ تھا۔[۳۳] اس کے برخلاف، قاسم لاہوری، جو خود کو سادات کا غلام کہتا ہے، سیدوں کا پُرجوش حامی ہے اور شہنشاہ کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جس نے سیدوں کے خلاف سازشیں کر کے اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر انہیں اپنا سخت مخالف بنا لیا۔[۳۴] مرزا محمد[۳۵] اور شفیع وریدؔ[۳۶] کا بیان یہ ہے کہ سیدوں کے عروج پر جب ایسے امرا کو حسد ہونے لگا جیسے میر جملہ، جو مُغل تھا اور خانِ دوراں، جو ہندی نژاد مسلمان تھا، تو انہوں نے پسِ پردہ سازشیں کرنے اور اپنے اختیارات برقرار رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ ان امرا نے شہنشاہ کو وزیر اور میر بخشی کے خلاف اُکسایا اور اس طرح دربار میں جھگڑے پیدا کر دیئے۔

فرخ سیر کا میر منشی، یحییٰ خاں، کچھ اور باتیں بھی تحریر کرتا ہے جن کی وجہ سے بادشاہ اور وزیروں کے درمیان خلیج اور گہری ہوگئی۔ وہ لکھتا ہے کہ وزارت، صدارت اور دیوان کے عہدوں پر تقرّری کے جو جھگڑے ہوئے ان کے علاوہ فرخ سیر اجارہ داری شروع کرنے اور جزیہ ختم کرنے کے سخت خلاف تھا۔[۳۷] محمد آشوب پوری صورتِ حال کو ایک فرقہ پرست کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصادم کا سبب وہ پرانی دشمنی تھی جو مغلوں اور برہا کے سیدوں کے درمیان رہی تھی۔ اس بموجب، سیدوں نے سارے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور مغل جو سلطنت کی پشت پناہ تھے، بے روزگاری اور مالی مصیبتوں کے شکار تھے۔[۳۸]

'تاریخِ ہند' جو نہایت مختصر اور جامع کتاب ہے، اس کا مصنف رُستم علی خاں دلیری کے اُن قابلِ دید کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جو حسین علی خاں نے انجام دیئے۔ اس کی سخاوت اور صوفیوں نیز اہلِ علم کی کھلے دل سے سرپرستی کی بھی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔[۳۹] لیکن آشوب، حسین علی خاں کی خوبیوں اور کارناموں کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ وہ بڑی کاوش کے ساتھ اس کے کردار کی خامیاں سامنے لاتا ہے۔[۴۰] ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تقریباً

سارے ہی مورّخین مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے مقابلے میں حسین علی کی اس مصالحانہ پالیسی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جس پر وہ عمل پیرا رہا۔ ان کی تحریروں سے سیدوں کے خلاف تعصب ظاہر ہوتا ہے، اور سیدوں نے زمینداروں اور علاقائی سرداروں کے معاملے میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اسے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ دُرست سہی کہ انہوں نے مقامی حکمرانوں سے جس انداز کے روابط قائم کئے تھے اُن کا مقصد یہ تھا کہ فرخ سیر سے کسی کا کوئی تعلق نہ رہے، لیکن اس حکمتِ عملی کی بنا پر بالواسطہ طور سے ان علاقوں میں شاہی اقتدار کا بول بالا ہوا، جن علاقوں میں جھگڑے فساد کا دور دورہ تھا۔

جب فرخ سیر کو شرمناک انداز میں معزول کیا گیا اور اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا تو سیدوں کے خلاف غم و غصے کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں ان پر نہ صرف غیر مطمئن امرا برہم ہوئے بلکہ سماج کے ادنیٰ طبقے بھی طیش میں آ گئے۔[41] فاتح وزیروں نے مغل تاج کی بے عزتی کی، سرکاری عہدے اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے بھر دیئے، اور معزول بادشاہ کی ذات پر سختیاں ڈھائیں۔ اُن مورّخین کے رویّے بھی یک لخت بدل گئے جو اس سے پہلے تک سیدوں کو حق بجانب ٹھہراتے تھے اور وہ ان کے بُرے افعال پر لعنت ملامت کرنے کے لئے سخت زبان استعمال کرنے لگے۔ یہ بات میر قاسم لاہوری[42] اور محمد قاسم اورنگ آبادی[43] پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔ فرخ سیر کی کمزور اور غیر مستقل حکمتِ عملی کے بارے میں اپنے سابقہ مشاہدات کے برخلاف، اُن مصنفین نے ان طریقوں کی مذمّت کرنا شروع کر دی جو سیدوں نے اختیار کئے تھے۔

(ii) ایک اور اہم معاملہ جس پر راویانِ واقعات ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، اقتدارِ اعلیٰ کے واسطے وہ سخت جدوجہد ہے جو مغلوں اور سیدوں کے درمیان ہوئی۔ حکمراں جماعت کے دو گروہوں کے درمیان مفادات کے اس ٹکراؤ کی وجۂ تسمیہ، اس کی وسعت اور نوعیت سمجھنے کے لئے، اس بات کی تشریح کرنا ضروری ہے کہ مورّخ خود کن گروہوں سے وابستہ تھے، ان کے تعلقات اور تحریک ذہنی کے ذرائع کیا تھے جن سے ان کے نظریات متاثر ہوئے۔ بیشتر کتابیں محمد شاہ یا نظام الملک کی سرپرستی میں لکھی گئیں، جو مغلوں کے تسلیم شدہ قائد تھے۔ مثال کے طور پر خفی خاں نے محمد شاہ کے دور میں اپنی کتاب مکمل کی، اور وہ لمبے عرصے تک نظام الملک کے تحت ملازم

رہا۔ محمد بخش آشوب مغل تھا، اور اقتدار کی جدوجہد کا بیان مغل نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ آبادی، احسن ایجاد، یوسف محمد خاں، منیم خاں اورنگ آبادی،[۴۴] منسا رام اور دوسرے لوگوں نے اپنے روزنامچے اس زمانے میں تالیف کئے جب نظام الملک کا آفتابِ اقتدار نصف النہار پر تھا۔

یہ مصنفین، دکن میں حکومت کے ملازم ہونے کے ناطے، اس نظام الملک سے ذاتی وفاداری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، جو ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سیدوں کے پاس ایسے چند ہی مورخین ہیں جو اُن کے معاملے کی وکالت کرسکیں۔ سیدوں کے حمائتیوں کی فہرست میں شاید رُستم علی خاں اور غلام حسین طباطبائی[۴۵] آسکتے ہیں۔ ان مختلف رایوں پر غور کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے:

> فرخ سیر کے زمانے میں لوگوں نے ایک یا دوسری جانب وہ جانبداری یا دُشمنی دکھائی ہے۔ جس کا کوئی حد وحساب نہیں، ان کی نظر اپنے فائدے یا نقصان پر رہی ہے، اور اپنے اسپ تصور کو اسی کے مطابق موڑ دیا ہے۔ ایک جانب کی ساری خوبیوں کو غلطیوں میں بدل دیا ہے اور دوسری جانب کی غلطیوں سے آنکھیں موند لی ہیں۔[۴۶]

خفی خاں یہ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے کہ واقعات تحریر کرتے وقت اس نے دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے، پھر بھی نظام الملک کے واسطے اپنی ہمدردیوں کو چھپا نہیں پاتا۔ وہ اپنے سرپرست کی غلطیوں کی بے جا تاویلیں کرتا ہے اور اس کے دُشمنوں کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظام الملک اس خیال کا مخالف تھا کہ سید برادران کو نمک بہ حرام اور حرام نمک کہا جائے۔[۴۷] لیکن نظام الملک نے شہنشاہ اور اپنے دوستوں نیز ماتحتوں کو جو عرضداشتیں اور خطوط بھیجے ان میں سے ہر ایک میں اس نے ان دونوں بھائیوں کے لئے خود یہ کلماتِ نازیبا استعمال کئے۔[۴۸]

(iii) یہ مورخین اس بات پر بالکل متفق نہیں ہیں کہ نادرشاہ نے ۱۷۳۸ء میں ہندوستان پر جو حملہ کیا اس کی دعوت آیا سادات خاں اور نظام الملک نے دی تھی یا یہ کہ خانِ دوراں نے صورتِ حال بگاڑ دی اور ایرانی حملے کے سیلاب کی روک تھام کے لئے جو تیاریاں ضروری تھیں ان کی طرف سے

سخت غفلت برتی۔ 'رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں' کے گمنام مصنف اور 'جوہر سمسام' کا مصنف ان دونوں اعلیٰ مغل امیروں پر کھلے طور سے غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کابل اور لاہور کے صوبیداروں کی مالی امداد نہ کی جس کی وجہ سے شمالی مغربی سرحد کے دفاعی مورچے مضبوط نہ کئے جا سکے۔ انہوں نے ناصر خاں اور زکریا خاں سے لاتعلقی برتی جس کے سبب بے حسی اور بیجا اطمینان کا ماحول بن گیا، شہنشاہ ایک غلط قسم کے احساسِ سلامتی سے مطمئن ہو گیا اور سرکاری عہدیدار باہری حملے کا سامنا کرنے کے واسطے جو کوششیں کر رہے تھے وہ ختم ہو گئیں۔ ۵۰

'رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں' اور 'جوہر سمسام' بڑے رنگین اور مبالغہ آمیز انداز میں لکھی گئی تھیں، اور لگتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے سرپرست، خانِ دوراں، کی حیثیت بڑھانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے مخالفین نظام الملک اور سادات خاں نے کرنال کے میدانِ جنگ میں جو رول ادا کیا، وہ اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ قمر الدین خاں جو نظام الملک کا بھتیجا اور وزیر تھا، اس کا دیوان آنند رام مخلص اور آشوب، جو مغل موقف کا سرگرم حمایتی تھا، یہ دونوں میر بخشی پر تہمتیں لگاتے ہیں اور اسے باہری حملے کے تباہ کن نتائج کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ امرا کے درمیان جو باہمی عداوتیں تھیں ان کے پیشِ نظر مورّخین کے ان سارے بیانات کی بڑے غور سے جانچ کی جانی چاہئے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی براہِ راست یا اتفاقی شہادت نہیں ہے جو سادات خاں اور نظام الملک پر لگائے جانے والے غداری کے الزامات کی تائید کر سکے۔

اٹھارہویں صدی کا تاریخی ادب اتنا کثیر ہے کہ ایک مقالے میں پورے طور سے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرکیف، اس ادب کی جانچ فنِ تاریخ نویسی کے جدید معیاروں سے نہیں کرنی چاہئے۔ مورّخین نے سطح سے نیچے دیکھے بغیر وہ سب باتیں لکھ دی ہیں جو پیش آئی تھیں۔ وہ باتیں جن کی تشریح یا تو کی نہ جا سکی یا جنہیں کسی مصلحت کے تحت چھپایا گیا ان کو مورّخین نے اتفاق یا مرضیِ خدا پر یہ کہہ کر محمول کر دیا کہ اس معاملے کی اصلیت اللہ ہی جانتا ہوگا۔ ان افواہوں کے بارے میں کہ نظام الملک کے اشارے پر سید عبداللہ کو زہر دے کر مارا گیا، خفی خاں نے اپنے سرپرست کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت کی چھان بین اور معاملے کی تہہ میں جائے بغیر اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اصل حقیقت سے اللہ ہی واقف ہے۔ یہ مصنّفین اپنے زمانے کی پیداوار تھے، اور ان کی تحریروں سے اس حکمراں طبقے کے رویّوں اور روایتوں کی عکاسی ہوتی ہے، جو اس دور کے

سیاسی حالات پر فیصلہ کن انداز میں اثر ڈالتا ہے۔

حوالہ جات

۱) نواب شاکر خاں، 'گلشنِ صادق'، پٹنہ دستاویز فولیو اے۔۴۴ز۔ نواب صدرالدین محمد خاں فیض، 'کُلّیاتِ فیض'۔ بوڈلیان دستاویز۔ علی گڑھ روٹوگراف، فولیو۱۲۲ر تا ۱۲۵۔

۲) اعتماد علی، مراتِ حقائق۔ بوڈلیان دستاویز۔ مرزا محمد علی خاں، مراتِ احمدی، گیکواڑ اورینٹل سیریز، ۱۹۲۷ء، آنند رام، سیاق نامہ، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدر آباد۔ کچھی نرائن شفیق، حقیقتِ ہندوستان، آصفیہ دستاویز، حیدر آباد۔ جواہر مل بیکس، دستورالعمل بیکس، علی گڑھ دستاویز۔

۳) موسوی خاں جرأت، 'منشاتِ موسوی خاں'، آصفیہ لائبریری دستاویز، حیدر آباد۔ منشی دیا رام، 'بالمکند نامہ'، پٹنہ دستاویز۔ صائب رائے۔ 'حجتہ کلام'۔ بھگوان داس، 'عزیز القلوب'، علی گڑھ دستاویز۔

۴) نظام الدین، 'نادر نامہ'، آصفیہ دستاویز۔ احسن ایجاد۔ 'شاہ نامہ دکن'، آصفیہ دستاویز۔ میر رضا ذوالفقار، 'شرف نامہ محمد شاہ'، بی۔ ایم۔ دستاویز۔

۵) کیول رام، 'تذکرۃ الامرا'، علی گڑھ دستاویز۔ مرزا محمد، 'تاریخِ محمدی'، رام دستاویز۔ شاہ نواز خاں، 'مآثر الامرا'۔ رستم علی خاں، 'تاریخِ ہندی'، بی۔ ایم دستاویز، خواجہ گل محمد، 'تکملہ سیر الاولیا'۔

۶) شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تفصیلات کے لئے دیکھئے، الفرقان، بریلی: اسلامک کلچر، ۱۹۵۱ء۔ خلیق احمد نظامی، 'تاریخِ مشائخ چشت'، دہلی ۱۹۵۳ء

۷) محمد بخش آشوب نے ۱۷۸۱ء میں لکھا تھا کہ اس دور میں فن تاریخ نویسی متروک ہو چکا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے کثیر تاریخی ادب کی روشنی میں یہ بیان غلط لگتا ہے۔ 'تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ'، بی۔ ایم۔ دستاویز، فولیو ۱۳۔

۸) خفی خاں، 'منتخب اللباب'، بب، انڈ، کلکتہ: ۱۸۷۴ء جلد دوم، صفحات ۶۰۰۔۷۶۹۔

۹) ایضاً، جلد دوم، صفحات ۶۲۷ تا ۶۲۸۔

۱۰) 'معاصر الامرا'، جلد اوّل، صفحات ۳۵۰ تا ۳۵۲۔

۱۱) 'منتخب اللباب'، جلد دوم، صفحہ ۶۳۰۔
۱۲) ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۶۷۷۔
۱۳) ایضاً، جلد اوّل، صفحات ۱۵۷ تا ۱۵۸۔ ایضاً، جلد دوم، صفحات ۶۰۰ تا ۶۹۷۔
۱۴) اعتماد علی خاں، 'مراتِ حقائق'، بوڈلین دستاویز سیتا مئور وٹوگراف۔
۱۵) احسن ایجاد فرخ سیر نامہ کا بھی مصنف ہے، جس میں محض فرخ سیر کے زمانے کی سیاسی تاریخ کا ذکر ہے، بی۔ایم دستاویز گر۔۲۵ (ریو ۱۲۷۳ء اے)
۱۶) میر محمد قاسم اورنگ آبادی، 'احوالِ خواتین'، بی۔ایم دستاویز، فولیو ۱۰۳ر تا ۱۰۵۔
۱۷) ارادت خاں، 'تاریخِ ارادت خاں'، علی گڑھ دستاویز، فولیو 2۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ ۵۳۵۔
خفی خاں اورنگ زیب کے دور میں سرکاری ملازم تھا۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو اسے نظام الملک کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے ذریعہ معلومات کی بابت یہ الفاظ لکھتا ہے:
'جو میں نے خود دیکھا، جو اُن لوگوں کی زبان سے سُنا جو وقتاً فوقتاً فرخ سیر سے وابستہ رہے تھے، اور جو سیدوں سے سُنا جو جنگ اور ضیافت میں اس کے شریک رہے تھے، اسے بڑی دیانت داری سے سپردِ قلم کر دیا ہے۔ اور جب بیانات میں اختلاف معلوم ہوا تو حق تک پہنچنے کی سخت کاوش کی ہے۔'
'منتخب اللباب'، جلد دوم، صفحہ ۷۲۷۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ ۴۴۔
۱۸) 'منتخب اللباب'، صفحہ ۷۲۶۔
۱۹) 'مراتِ وریدات'، علی گڑھ دستاویز، صفحہ ۱۰۔
۲۰) 'منتخب اللباب'، جلد دوم، صفحات ۶۰۱ تا ۶۰۲، ۶۲۷ تا ۶۲۸۔ کامراج بن نین سنگھ۔ 'عبرت نامہ'، بی۔ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو اے۔۳۶۔
۲۱) نورالدین فاروقی، 'جہاندار نامہ'، بی۔ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو ۳۶ تا ۳۸
شیخ محمد معین، 'فرخ نامہ'، بی۔ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو ۷۴ تا ۷۵، ۸۹۔
۲۲) مرزا محمد، 'عبرت نامہ'، پٹنہ دستاویز، فولیو ۹۵ تا ۹۶۔
۲۳) یحییٰ خاں، 'تذکرۃ الممالک'، بی۔ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو ۱۳۲۶۔
۲۴) تاریخِ شہادت فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، بی۔ایم دستاویز، فولیو ۴۳۔ اے، مراتِ وریدات، صفحات ۶۴۴ تا ۶۴۵۔
۲۵) اس پہلو پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے، اسٹڈیز ان اسلام، دہلی جنوری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۳۳۔

۲۶) 'احوالِ خواتین'، فولیو۱۸۱۔ 'مراتِ حقائق'۔ فولیو۹۲۔ اے۔
۲۷) 'منتخب اللباب'، صفحہ ۷۷۶۔ 'عبرت نامہ'، کامراج، فولیو۴۶۔ اے، ۵۴۔ اے۔
۲۸) 'مراتِ وریدات'، صفحہ ۶۴۴۔
۲۹) 'حدیقۂ نادرشاہ'، (گمنام)، آصفیہ دستاویز، فولیو۴۔ اے۔
۳۰) کامراج، 'عبرت نامہ'، فولیو۵۴۔ اے۔
۳۱) 'احوالِ خواتین'، فولیو۷۷۔ اے۔ 'تاریخِ شہادتِ فرخ سیر وجلوسِ محمد شاہ'، فولیو۴۲۔ اے۔
۳۲) مرزا محمد، 'عبرت نامہ'، فولیو۱۰۲/تا۱۰۳۔ میر قاسم لاہوری، 'تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر'، بی۔ ایم دستاویز، فولیو۶۲۔ اے۔
۳۳) 'منتخب اللباب'، صفحہ ۷۳۸۔
۳۴) 'تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر'، فولیو ۱۶، ۲۔ اے، ۶۶ بی۔
۳۵) مرزا محمد، 'عبرت نامہ'، فولیو۳۰۔
۳۶) 'مراتِ وریدات'، صفحہ ۵۰۵۔
۳۷) 'تذکرۃ الممالک'، فولیو۱۲۲، ۱۲۴۔
۳۸) 'تاریخِ شہادت فرخ سیر وجلوسِ محمد شاہ'، فولیو۷۰۔ اے، ۴۳۔
۳۹) 'تاریخ ہندی'، صفحہ ۷۷۲۔
۴۰) 'تاریخِ شہادتِ فرخ سیر وجلوسِ محمد شاہ'، فولیو۳۸، ۴۲ تا ۴۳۔
۴۱) 'شاہ نامۂ منور کلام'، فولیو۳۱۶۔
۴۲) 'تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر'، فولیو ۷۶ تا ۷۷، ۸۰۔
۴۳) 'احوالِ خواتین'، ۸۸۔ اے، ۱۴۵۔ بی، ۱۵۲۔ اے۔
۴۴) منیم خاں اورنگ آبادی، 'سوانحِ دکن'، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد دستاویز۔
۴۵) غلام حسین طباطبائی، 'سیر المتاخرین'، (متن) کلکتہ، II، ۱۸۳۶ء، صفحات ۲۱ تا ۲۲، ۳۰، ۳۷ تا ۳۹۔
۴۶) 'منتخب اللباب'، صفحہ ۷۲۶۔
۴۷) 'منتخب اللباب'، صفحہ ۹۴۰۔

خفی خاں مصطفےٰ آباد دکن کے خالصہ محل میں فوجدار اور امین کے عہدوں پر فائز رہا۔ یہ محل بُرہان پور کے صوبیدار کے افسران نے تباہ کر دیا تھا۔ رعیت بھاگ گئی تھی اور کاشتکاری ختم ہو گئی تھی، خفی خاں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ محل دوبارہ بسایا اور تحصیل وصول کے لئے

سپاہی بھرتی کرنے پر دولت صَرف کی۔ ۱۷۱۸ء میں دکن کے صوبیدار حسین علی خان نے دہلی کی سمت کوچ کا ارادہ کیا، جہاں اس کی موجودگی نہایت ضروری ہوگئی تھی کیونکہ وزیر سید عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان تصادم ایک نازک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ حسین علی خاں نے توپ خانے کے خرچ کے لئے خفی خاں سے بیس ہزار روپے طلب کئے۔ چونکہ خریف کی فصل ابھی کٹی نہیں تھی، اس لئے خفی خاں مطلوبہ رقم فراہم نہ کر سکا۔ صوبیدار نے یہ رقم دوسرے ذرائع سے حاصل کی اور مورخ کو برخواست کر دیا۔ اس عہدے سے برطرفی جسے خفی خاں نے بڑی مشکلات کا سامنا کر کے حاصل کیا تھا، غالباً اس کے ذہن میں کھٹکتی رہی اور وہ حسین علی خاں سے بدظن ہو گیا۔ جلد دوم، صفحہ ۷۹۸۔

۴۸) 'منشاتِ موسوی خاں'، فولیو ۴۸، ۵۱۔

۴۹) 'رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں'، گمنام، بی۔ ایم دستاویز، فولیو ۱۰۰، ۱۰۳ رتا ۱۰۵۔
محمد محسن، 'جوہر سمسام'، بی۔ ایم دستاویز یا ۱۸۹۸ء، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہشتم، صفحہ ۷۵۔

۵۰) آنند رام مخلص، 'تذکرہ'، علی گڑھ دستاویز، فولیو ۱۱۹ رتا ۱۲۰۔ 'تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ'، فولیو ۱۶۲، فولیو ۱۶۲ تا ۱۶۴۔

علاقائی تاریخ نویسی:
تاریخِ گجرات کے خصوصی حوالے سے

احمد سلیم

زیرِ نظر مقالہ پاکستان میں علاقائی تاریخ نویسی کے پس منظر اور پیش منظر کا جائزہ لینے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جب تک ہم اپنی تاریخ کو علاقائی پہلو سے نہیں دیکھیں گے، پاکستان کی قومی تاریخ وجود میں نہیں آ سکے گی۔ 'علاقائی تاریخ نویسی' کیا ہے، اس بارے میں وضاحت سے اور کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ ایک مشکل سوال ہے جس کے کئی پیچیدہ پہلو ہیں۔ علاقائی تاریخ نویسی سے محض یہ مراد نہیں ہے کہ محلوں، بازاروں اور دیہی سماج کی تصویریں پیش کی جائیں۔ جب ہم علاقائی تاریخ نویسی کا سوال اٹھاتے ہیں تو کئی سوال ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ کیا کوئی بھی تاریخ کسی جغرافیائی اور علاقائی حقیقت کے بغیر وجود میں آ سکتی ہے؟ کیا کوئی تاریخ غیر علاقائی بھی ہو سکتی ہے؟ کیا علاقائی تاریخ کے بالمقابل قومی تاریخ کسی علاقے یا علاقوں کی تاریخ نہیں ہوتی؟ پاکستان کے تناظر میں دیکھیں تو یہ دائروں میں دائرے کا سفر ہے، چھوٹے دائرے سے بڑے دائرے کا سفر۔

- ہمارے یہاں کم از کم چار علاقائی تواریخ ایسی ہیں جو قومی تاریخ کے دائرے سے باہر ہیں۔
- قومی تاریخ نویسی کی بنیاد ان خاندانوں پر رہی ہے جو محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور غوری کے حملوں سے لے کر سلطنت عہد کے مختلف خاندانوں، خاندانِ مغلیہ اور آخر میں برطانوی حکومت پر مشتمل تھی۔
- جبکہ ہماری علاقائی تواریخ میں لازمی طور پر یہ خاندان یا ان کی یہ ترتیب نہیں ہوتی۔ مثلاً سندھ میں سومرہ، سمہ، کلہوڑا، تالپور ادوار کی تاریخ یا سرحد/ بلوچستان میں قبائل کی تاریخ۔

ہمارا اگلا سوال یہ ہے کہ کیا 'علاقائی' سے مراد 'صوبائی' تاریخ ہے؟ اور 'علاقائی' کی

اصطلاح میں تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا؟

- اس کے خلاف ردِ عمل کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔
- کیا علاقائی تاریخ نویسی، پاکستان کی قومی تاریخ سے الگ تھلگ کوئی جداگانہ تاریخ ہے؟
- یا وہ کیا عناصر ہیں جو تاریخ کو علاقائی اور قومی میں تقسیم کرتے ہیں؟
- اگر سندھ پاکستان کا ایک صوبہ ہے تو سندھ کی تاریخ قومی تاریخ کا ہی ایک عنصر ہونی چاہیے۔

اس بحث کو سمجھنے اور کسی نتیجے تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پاکستان کی مختلف علاقائی تواریخ کا جائزہ لیں اور ساتھ ہی قومی سطح پر تاریخ نویسی کے عمل کو بھی دیکھیں۔ اس سلسلے میں چار نمایاں رجحانات کا ذکر کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مرکز سے وفاداری یا مقامی تاریخی عناصر کے بجائے مرکزی یا قومی تاریخ کے عناصر پر زور دینا مثلاً پاکستان کی قومی تاریخ میں سندھ کے سمہ، سومرہ، کلہوڑا اور تالپور ادوار کو نظر انداز کر کے سلطنت اور مغل ادوار کو اہمیت دی جائے۔

۲۔ مرکز گریز یا قوم پرستانہ تاریخ نویسی، جس میں صرف مقامی تواریخی عناصر پر زور دیا جائے اور مشترکہ قومی حوالوں کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے بعض علاقے دوسرے ملکوں سے بھی تاریخی اور تہذیبی رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں جیسے پنجاب اور سندھ کی تاریخ ہندوستان میں بھی لکھی جاتی ہے۔ خصوصاً متحدہ ہندوستان کا دور دونوں ملکوں کی تاریخ نویسی کے حوالے سے پنجاب کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسی طرح بلوچستان اور پشتون علاقوں کی تاریخ پاکستان کے علاوہ افغانستان اور ایران میں بھی زیرِ بحث آتی ہے۔

۴۔ چوتھا رجحان کسی مخصوص عہد کے حوالے سے واقعات و حالات سے عبارت ہے مثلاً برطانوی عہد میں اس سوال پر بحث کہ اگر انگریز نہ ہوتے تو کیا ترقی نہ ہوتی؟ اور اس سوال کو سمجھنے کے لیے ضلعی گزیٹیرز، مردم شماری رپورٹوں، رواجِ عامہ اور سیٹلمنٹ رپورٹوں وغیرہ کا جائزہ۔ گویا ایک ہی خطے کی تاریخ کے چار مختلف حوالے یا رجحانات ہیں۔

علاقائی تاریخ یا دائروں میں دائرے کے سفر کے سوال کو سمجھنے کے لیے ہم نے پنجاب کے ضلع گجرات کی فارسی تاریخ نویسی کا انتخاب کیا ہے اور اس کے ذریعے سے یہ سمجھنے کی کوشش کی

ہے کہ ایک چھوٹے سے دائرے میں سفر کرنے کی صورت میں ہمیں کیسی کیسی تاریخی تفصیلات سے آگہی حاصل ہوئی ہے۔ یہ تمام تفصیل نہ تو ہمیں صوبہ پنجاب کی تاریخ میں مل سکتی ہے اور نہ ہی تاریخِ پاکستان کی کسی مفصل یا مختصر تاریخ میں۔

یہ سوال کہ اس مقصد کے لیے ہم نے گجرات کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ خود اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے جسے ہم نے مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخِ گجرات: انیسویں صدی کے فارسی مآخذ

> میرے لیے گجرات ہی میرا گھر ہے۔ میرے خاندان کا اصل تعلق تو کالا سرائے سے ہے لیکن میرے ذہن میں کالا سرائے کی کوئی یاد نہیں۔ کینال کالونیوں کی یادیں بڑی گریز پا تھیں۔ گجرات میں ہماری اپنی برادری تھی، اپنے رشتے دار تھے، ہم رہتے بھی وہیں تھے۔ یوں گجرات ہی میرا گھر ہے۔ پنجابی زبان کا لفظ گھر یا فارسی زبان میں لفظ 'وطن' ہمارے لیے بڑا عزیز تھا۔ کسی اجنبی سے اس کا نام یا ذات پوچھنے سے پہلے آپ اس کا وطن پوچھتے تھے۔ اگر دونوں کا وطن ایک ہی ہو یا قریب قریب ہو تو فوراً ہی رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔ کسی اجنبی شہر میں آپ دونوں ایک برادری بن جاتے تھے اور برادری کے تمام حقوق و فرائض آپ پر عائد ہو جاتے تھے۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس پرکاش ٹنڈن کی انگریزی تصنیف 'پنجاب کے سو سال' جس کا اردو ترجمہ رشید ملک نے کیا ہے، سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سادہ اور سیدھی سی تحریر میرے اس مقالے کا محرک بنی ہے۔ میری صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہے۔ گجرات ہی میرا گھر ہے۔ میرے پُرکھے ضلع جہلم کے قصبے پنڈ دادن خان سے نقل مکانی کر کے ضلع گجرات کے ایک گاؤں میانہ گوندل میں آ کر بس گئے تھے۔ پنڈ دادن خان کئی وجوہ کی بنیاد پر مجھے بہت عزیز ہے لیکن میرا گھر گجرات ہی ہے۔ اگرچہ ضیاء الحق کے دور میں ضلع گجرات کو کاٹ کر دو اضلاع بنا دیئے گئے تھے اور میرا انتظامی تعلق ضلع منڈی بہاؤالدین سے ہو گیا لیکن گجرات، چند بدنامیوں کے باوجود میرا گھر، میرا وطن ہی رہا ہے اور اس حوالے سے یہ چھوٹا سا مطالعہ گجرات سے میرے اسی ذہنی اور روحانی تعلق کا نتیجہ

ہے۔

موجودہ صورتِ حال

گجرات کے بارے میں فوری طور پر کسی ایسی کتاب کا نام لینا مشکل ہے جسے اس قدیم شہر کی باضابطہ تاریخ کہا جاسکے لیکن یہ بات تو لاہور پر بھی صادق آتی ہے جس کے بارے میں درجنوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ گجرات کے بارے میں بھی ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں بھرپور تاریخی مواد موجود ہے پھر بھی ان میں سے کسی ایک کتاب کو بھی تاریخِ گجرات کہنا مشکل ہے، خواہ اس کتاب کا نام 'تاریخِ گجرات' ہی کیوں نہ ہو۔ میری رائے میں یہ صورتِ حال مایوس کن سے زیادہ امید افزا ہے کیونکہ کسی علاقے کی تاریخ نویسی کے لیے درجنوں کتابوں کی دستیابی ہی سب سے اہم بنیاد ہے۔

گجرات کے بارے میں تاریخی تذکروں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قیامِ پاکستان سے قبل

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد

قیامِ پاکستان کے بعد کا دور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے معیار سے بھی کوسوں دور ہے اور تاریخ نویسی میں ترقی اور تحقیق کی سہولتوں میں اضافے کے باوجود کوئی ٹھوس کام نظر نہیں آتا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک بڑی وجہ ۱۹۴۷ء کے بعد گجرات سے ہندوؤں اور سکھوں کا اخراج ہے۔ ہندو سکھ گجرات سے کیا گئے، ہم نے انہیں تاریخ کی کتابوں سے بھی خارج کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ علاقائی اور ضلعی تاریخ نویسی کو، نہ صرف قومی تاریخ نویسی کا حصہ نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے کم تر حیثیت کا حامل بھی قرار دیا گیا۔ تاریخ کی قومی کانفرنسوں میں علاقائی و ضلعی تاریخ نویسی کے موضوع کو سرے سے خارج کر دیا گیا جو قیامِ پاکستان سے قبل آل انڈیا ہسٹری کانگریس کی تقریبات کا لازمی جزو شمار ہوتا تھا۔ ایک اور اہم وجہ عربی، اور فارسی سے عدم واقفیت اور سنسکرت و ہندی سے مکمل دوری ہے جس کے باعث تاریخِ گجرات کے بعض اہم بنیادی ماخذ قابلِ رسائی نہ رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور سمیت، پنجاب کی متعدد لائبریریوں سے ہندی اور گورمکھی کی کتابیں نکال کر جلا دی گئیں یا ردّی میں بیچ دی گئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے

مورّخین نے نوآبادیاتی انگریزی ریکارڈ کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا جس کی وجہ سے بہت سا کارآمد تاریخی مواد، تاریخ کی نئی کتابوں کا حصہ نہ بن سکا۔ ایک وجہ یہ بھی رہی کہ قومی تاریخ کی کتابوں میں زمانی ترتیب کو ہم نے من وعن اپنی ضلعی تاریخ نویسی کا حصہ بنانے کی کوشش کی اور قابلِ قدر مقامی مواد، لوک ادب، میراثیوں کی بیان کردہ حکایات، پٹواریوں کے گوشواروں اور دفتر مال کے کاغذات میں سے تاریخی حقائق اور تفصیلات کو کھوجنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بدقسمتی سے ایک اور اہم اور قیمتی ماخذ بھی ہماری توجہ حاصل نہ کرسکا یعنی بزرگوں سے سنی ہوئی زبانی روایات جو ان کے براہِ راست تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہوتی ہیں۔ اگر اس طرف توجہ کی گئی ہوتی تو ان کی بنیاد پر اواخر انیسویں اور پوری بیسویں صدی کے گجرات کی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی تاریخ کے بہت سے حقائق ہمارے سامنے ہوتے۔ اسی طرح اِکّادُکّا خودنوشت سوانح عمریوں کو چھوڑ کر درجنوں سیاسی، صحافتی اور علمی شخصیتوں نے ہمیں اس اہم تاریخی ماخذ سے بھی محروم رکھا۔ گجرات کی مقامی صحافت اگرچہ درخورِ اعتنا نہیں رہی لیکن جو اِکّادُکّا اخبارات و جرائد یہاں سے نکلتے رہے، وہ بھی آج محفوظ نہیں ہیں جن کی مدد سے کئی ٹوٹے ہوئے تاریخی سلسلے جوڑے جاسکتے تھے۔ ایک اور چھوٹی سی وجہ یہ تھی کہ دستیاب مواد کی چھان پھٹک سے کام نہ لیا گیا اور جو واقعہ جہاں سے ملا اسے بغیر کسی معروضی کھوج پرکھ کے تاریخ قرار دے کر کتاب میں شامل کرلیا گیا۔ ان تمام وجوہات کا سرسری جائزہ لینے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تاریخ نویسی کے معاملے میں ہم چند در چند مسائل کا شکار رہے ہیں جنہیں دور کیے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہوگا۔

مندرجہ بالا معروضات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل غلط ہوگا کہ تاریخِ گجرات کے سلسلے میں کوئی کام ہوا ہی نہیں یا جو کام ہوا ہے، اس کی اہمیت اور وقعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ میں نے ابتداء میں کہا کہ صورتِ حال مایوس کن سے زیادہ امید افزا ہے اور ہم بکھرے ہوئے ملبے سے تاریخِ گجرات کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ یہ کام کب ہوگا اور کون کرے گا؟ یہ سوال سرِ دست، قبل از وقت ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بہت سا تاریخی مواد موجود ہے۔

اوّلین فارسی مآخذ

اس مواد میں خاصے ماخذ فارسی زبان میں ہیں، جنہیں یا تو سرے سے نظرانداز کیا گیا ہے یا

مورخین کی ان تک رسائی نہیں ہوسکی۔ ان میں چند قابلِ ذکر ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔:

۱۔ شاہ نامہ احمدی

کیپٹن ایلیٹ کی کتاب 'دی کرانیکلز آف گجرات' کے اردو ترجمے کے پیش لفظ میں 'احوال و آثارِ گجرات' کے عنوان سے پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری نے مُلّا فیض اللہ سامع کی ایک فارسی تصنیف 'شاہ نامہ احمدی' کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے کتاب کی تاریخ، تصنیف یا تاریخِ اشاعت نہیں دی تاہم وہ تاریخِ گجرات کے سلسلے میں اسے ایک اہم ماخذ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ فارسی نظم احمد شاہ ابدالی کے پنجاب پر حملوں کی تفصیل بیان کرتی ہے گجرات چونکہ راستے میں پڑتا تھا اس لیے گجرات کے متعدد مقامات کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ کتاب کے ایک شعر کے مطابق ۔

چو شاہ کرد بحرِ جیلم عبور
ہند آمد از راہِ بہلول پور[۲]

(جب شاہ نے دریائے جیلم (جہلم) کو عبور کیا تو وہ براستہ بہلول پور یعنی گجرات، ہند میں داخل ہوا۔) پروفیسر موصوف اسے تاریخِ گجرات کے حوالے سے ایک وقیع ماخذ قرار دیتے ہیں جبکہ عارف علی میر اپنی کتاب 'تاریخِ جلالپور جٹاں' میں یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ:

یہ کتاب گجرات کی تاریخ نہیں۔ گجرات پر احمد شاہ ابدالی کی فوج کشی پر چند اشعار کو ہم گجرات کی تاریخ نہیں کہہ سکتے۔[۳]

عارف علی میر کا خیال ہے کہ اس طرح تو شاعری کی بعض دیگر کتابوں میں گجرات کے بارے میں اس سے بھی زیادہ مواد ہے۔ یہ نکتہ توجہ طلب اور قابلِ بحث ہے۔

۲۔ واقعاتِ درّانی

لیکن فارسی زبان کی ایک اور تصنیف، 'تاریخِ احمد' یا 'تاریخِ احمد شاہی'، احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر پانچ حملوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کی بھی حامل ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر کی تحقیق کے مطابق منشی عبدالکریم نے اپنی یہ تصنیف ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶-۴۷) یا

۱۲۶۴ھ (۴۸-۱۸۴۷) میں مکمل کی تھی جسے محمد عبدالرحمان خان ولد حاجی محمد روشن خان نے ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹) میں شائع کیا تھا۔ اسی ناشر نے میر وارث علی سیفی سے اس متن کا اردو ترجمہ کروایا اور اسے ۱۲۹۲ھ (۷۶-۱۸۷۵) میں 'واقعاتِ درّانی' کے نام سے شائع کیا۔ یہ نایاب اردو ترجمہ بعد ازاں پنجابی ادبی اکادمی نے ۱۹۶۳ء میں دوبارہ شائع کیا۔[۴]

منشی عبدالکریم کی مذکورہ کتاب میں گو گجرات کے حوالے سے زیادہ تفصیل نہیں ملتی لیکن دو حوالے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک حوالہ احمد شاہ کے پوتے زمان شاہ کے لاہور سے خراسان جانے کے بارے میں ہے:

> اس عرصے میں عرضیاں زمان خان پسر حاجی کریم داد خان اور دوسرے دولت خواہوں کی متواتر پہنچیں کہ سلطان محمود پھر ارادۂ فاسد رکھتا ہے۔ چنانچہ شاہ بحر دسنے اس خبر کے غرۂ شعبان ۱۲۱۱ھ (۳۰ جنوری ۱۷۹۷ء) کو دریائے راوی کا کشتیوں کے پل واقع لاہور سے اور دریائے چناب کو گزر سودرہ (سوہدرہ) سے کہ دو کوس وزیر آباد سے ہے، پایاب عبور کیا اور منزلِ گجرات میں چار آدمیوں کو قوم درّانی سے کہ سادات کا گاؤں انہوں نے لوٹ لیا تھا، ان کا پیٹ چاک کرا کے قتل کیا۔[۵]

دوسرا اہم حوالہ پنجاب کے دوآبوں کے ضمن میں ہے۔ منشی عبدالکریم، پنجاب کے دوآبوں کا حال بیان کرتا ہے۔ دوسرے دوآبے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> 'یہ دوآبہ درمیان دریائے جہلم اور دریائے چناب کے ہے۔ عرض اس کا شاہراہ میں اکتیس کوس ہے۔ اس کے مقام آبادی سے قصبہ دنکیاں ہے کہ راجہ اس کا خداداد خان ہے اور گاؤں شادی وال، کہ تین گاؤں اس نام کے ہیں۔ یہاں راجپوت مسلمان رہتے ہیں اور شہر گجرات، میاں دولہ اور قصبات اور شہر بہت سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دریائے چناب، پنجاب کے سب دریاؤں سے بڑا ہے اور سب صورت میں گنگ دریائے ہندوستان سے مشابہ ہے۔ شیرینی میں گنگا کے پانی سے بہتر اور خوشگوار اور ہاضم اور صحت بخش ہے'۔[۶]

اسی مصنف کی ایک اور فارسی تصنیف 'تاریخِ پنجاب تحفہ احباب' ہے جس میں رنجیت سنگھ کے احوالِ سلطنت، سکھوں کی انگریزوں سے لڑائیوں اور پنجاب کے مختلف اضلاع سے سکھوں کے خراج کی وصولی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں گجرات کی جنگ کا تفصیلی نقشہ، صفوف بندی اور وضع توپ خانہ ورسالہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔[۷]

۳۔ تاریخِ پنجاب

بوٹے شاہ کی 'تاریخِ پنجاب' جس کے مقدمے کا پنجابی ترجمہ ۱۸۵۰ء میں لدھیانہ مشن پریس سے شائع ہوا، فارسی میں ۱۸۴۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔ پنجابی ترجمہ منشی بہلول نے کیا تھا۔ بوٹے شاہ اور منشی بہلول دونوں کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ غلام محی الدین عرف بوٹے شاہ نے یہ کتاب گورنر جنرل کے ایجنٹ رسل کلارک کی فرمائش پر لکھی تھی۔ کلارک لدھیانہ میں برٹش ایجنسی کا کرتا دھرتا تھا۔ پنجاب پر انگریزی قبضے سے قبل بوٹے شاہ ۱۸۳۷ میں لاہور دربار میں حاضری دے چکا تھا۔ 'تاریخِ پنجاب' میں مقدمہ، پانچ دفتر یا حصے اور ایک خاتمہ شامل ہیں۔ پانچوں حصے ابتدائی ہندو عہد، مسلم عہد، سکھ تاریخ اور مہاراج رنجیت سنگھ کے اقتدار اور عروج کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ کتاب کا مقدمہ پنجاب کے جغرافیائی حالات، دوآبوں، شہروں، قصبوں اور آبادی کے کوائف پر مبنی ہے جن میں گجرات کنجاہ، جلالپور جٹاں اور چہت دوآبے کے بعض دیگر شہروں اور قصبوں کا بھی ذکر ہے۔ اختصار کے باوجود، تاریخِ گجرات کے حوالے سے اس مقدمے کی بے حد اہمیت ہے مثلاً کنجاہ کے بارے میں لکھا ہے:

> یہ شہر، اب پہلے سے زیادہ آباد ہے کیونکہ دیوان محکم چند کے بیٹے موتی رام نے اپنے رہنے کے لیے وہاں خوبصورت حویلیاں بنوائی ہیں۔ شہر کے مشرقی جانب ایک باغ اور جنوب کی طرف سیڑھیوں والا کنواں ہے۔[۸]

اسی طرح گجرات کا ذکر ان لفظوں میں ملتا ہے:

> شہر کے اندر ایک قدیم اور پختہ قلعہ ہے۔ قلعے کے اندر سکھوں نے نئے گھر بنا لیے ہیں۔ سکھوں نے اس شہر کو بے حد لوٹا ہے۔ اس وقت تین ہزار گھر اور دو سو دکانیں ہیں۔[۹]

بوٹے شاہ کے بیان سے آج کے کنجاہ اور گجرات کی تصویر کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اسی طرح موجودہ جلالپور جٹاں کا تقابل مورّخ کی درجِ ذیل عبارت سے کرنا بھی قابلِ توجہ ہے:

> اس شہر (گجرات) سے پانچ کوس کے فاصلے پر قصبہ جلالپور وڑائچ گوت کے جاٹوں کا آباد کیا ہوا ہے (مرزا اعظم بیگ کے مطابق اسے جلال نامی گوجر نے اکبر بادشاہ کے عہد میں آباد کیا تھا لیکن ہندال وڑائچ نے اس پر بزور قبضہ کرلیا تھا) اس کے عمارتیں کچی ہیں لیکن آبادی کے باعث بہت رونق ہے۔ اس وقت دو ہزار گھر اور سو دکانیں آباد ہیں۔ شہر کے اندر، حاکمِ شہر کی رہائش کے لیے ایک خوبصورت پختہ حویلی بنی ہوئی ہے۔ چودھریوں کے گھر بھی پختہ بنے ہوئے ہیں۔ جلالپور سے آدھے کوس کی مسافت پر اسلام گڑھ کا قلعہ چودھری رحمت خان وڑائچ نے بنایا تھا۔ یہ قلعہ تھا تو کچا ہی لیکن بہت سڈول اور اچھا بنا ہوا تھا اور دور سے بہت خوبصورت نظر آتا تھا کیونکہ اس کے گرد کنگروں کی دیوار تھی جو اب جگہ جگہ سے گر گئی ہے۔ اس قلعے اور جلالپور کی بائیں سمت ایک خشک نہر ہے، جو برسات کے دنوں میں چلتی ہے۔[۱۰]

یہ مثالیں صرف کتاب کے مقدمے سے لی گئی ہیں۔ پانچ دفتروں پر مشتمل یہ ضخیم کتاب تاریخِ گجرات کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے خصوصاً رنجیت سنگھ کے عہد کے حوالے سے لیکن یہاں ان کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

۴۔ چار باغ پنجاب

گنیش داس بڈیسہرا کی فارسی تصنیف 'چار باغِ پنجاب' چار پرگنوں راولپنڈی، گجرات، سیالکوٹ اور لاہور کی سیاسی، جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کا احوال بیان کرتی ہے۔ کتاب کا بڑا حصہ گجرات کے بارے میں ہے جہاں کا گنیش داس رہنے والا تھا۔ مصنف کے مطابق پہلے اس نے اپنی کتاب کا نام 'رسالۂ صاحب نامہ' رکھا تھا، بعد ازاں دوستوں کے مشورے پر چار پرگنوں کی تاریخ کی نسبت

سے اس کا نام 'چار باغِ پنجاب' کر دیا[11] کتاب کی تکمیل دیوالی کے روز ۹ نومبر ۱۸۴۷ء کو ہوئی تھی، اس نسبت سے اسے 'چراغِ پنجاب' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے[12] گنیش داس نے اپنی یہ تصنیف انگریزی قبضے کے بعد ۱۸۴۹ء میں ناظمِ پنجاب ہنری لارنس کو پیش کی۔

بڈیہرا ذات کا کھتری گنیش داس خود اپنا تعارف پرگنہ گجرات کے ایک قانون گو اور چچ دوآب کے ایک زمیندار کے طور پر کرواتا ہے۔ اس کے بیشتر پُرکھوں نے اپنے اپنے وقت کی سرکار کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ خاندان کا بانی کا کامل پٹن سے نقل مکانی کر کے گجرات آیا تھا، جہاں پہلے جموں کے بیرم دیو اور بعد ازاں سکندر لودھی کے تحت اس نے سول انتظامیہ میں خدمات انجام دیں۔ اسلام شاہ نے اس کے بیٹوں کو سیالکوٹ کی قانون گوئی اور سرشتہ داری عطا کی۔ کاکامل کی پانچویں پشت میں مرار داس راجہ مان سنگھ کی سیالکوٹ جاگیر کا دیوان مقرر ہوا۔ اس کے چھوٹے بھائی شنکر داس کی جہانگیر نے سرپرستی کی اور سب سے چھوٹا بھائی سوِندر داس بھی منصب دار مقرر ہوا۔ کاکامل کی پشت میں سے ایم ملک جیٹھا اکبر کے دورِ حکومت میں گجرات کا قانون گو بنا۔ ملک جیٹھا کی اولادوں کا گجرات کی قانون گوئی پر تصرف ہو گیا اور یہ عہدہ ملک جیٹھا کی نویں پشت میں گنیش داس تک پہنچا۔[13]

گنیش داس اپنے پُرکھوں کی خدمات کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے جن میں سے بعض مسلمان ہو گئے تھے اور جنہوں نے خطاطی، ریاضی، موسیقی، شاعری اور تاریخ میں کمال حاصل کیا۔ گنیش داس اپنے پُرکھوں میں گجرات کے رئیس بھوانی داس کا ذکر بھی کرتا ہے، جو اس کا دادا تھا۔ اس کا باپ شِو دیال پرگنہ گجرات کے قصبے فتح گڑھ کا عامل اور ناظم تھا۔ خود گنیش داس مہاراجہ رنجیت کے لاہور دربار کے تحت گجرات کا قانون گو اور زمیندار تھا۔[14]

لیکن گجرات کی تاریخ نویسی کے حوالے سے 'چار باغِ پنجاب' کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈالنے سے قبل گنیش داس کے ابتدائی کاموں پر ایک سرسری سی نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ 'چار باغ پنجاب' سے کچھ ہی قبل اس نے سکھوں کی ایک تاریخ قلم بند کی تھی پھر جموں کے راجہ گلاب سنگھ کی فرمائش پر اس نے 'راج درشنی' تصنیف کی جو جموں کی تاریخ کے سلسلے میں اہم تاریخی ماخذ شمار ہوتی ہے[15] ایک اور اہم تصنیف 'مراۃ القوانین' قلمی نسخے کی صورت احمد حسین احمد قریشی قلعداری کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ تصنیف قدیم راجاؤں کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔[16]

'چار باغ پنجاب' کا بڑا حصہ گجرات کے بارے میں ہے اگرچہ اس نے تین دوسرے پرگنوں اور دو آبوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ سو سے زائد صفحات میں اس نے رچنا دوآب اور چج دوآب میں شامل علاقوں کا ذکر کیا ہے، شاید اس لیے کہ یہ علاقے اچھی طرح سے اس کے دیکھے بھالے تھے اور گجرات کا تو وہ خود رہنے والا تھا۔ تیسرے نمبر پر باری دوآب کا ذکر ملتا ہے جس کے دو بڑے شہروں لاہور اور امرتسر سے وہ اچھی شناسائی رکھتا تھا۔ سندھ ساگر دوآب کو اس نے گیارہ صفحات میں اور بست جالندھر کو صرف چار صفحات میں سمیٹا ہے۔ پوری کتاب کا ایک تہائی حصہ گجرات، سیالکوٹ، وزیر آباد، ایمن آباد، لاہور اور امرتسر کے بارے میں ہے[15] اس عدم توازن کے حوالے سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ جن علاقوں کے بارے میں وہ اچھی طرح بات کرسکتا تھا۔ ان کے بارے میں اس نے تفصیل سے کام لیا ہے اور جن علاقوں کے بارے میں وہ کم جانتا تھا ان کے بارے میں اس نے اِدھر اُدھر کی کہانیاں سنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے احتیاط کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی تاریخ کے بجائے اس نے جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا۔

گنیش داس نے اپنی یہ تصنیف ۱۸۵۴ء میں سر آرسی ٹمپل (لی جنڈز آف دی پنجاب' کے مصنف رچرڈ ٹمپل کے والد) جو اس وقت گجرات کے سیٹلمنٹ افسر اور ڈپٹی کمشنر تھے، کی خدمت میں پیش کی یا پھر انہیں کسی اور ذریعے سے ملی۔ تاہم انہوں نے ۱۸۵۵ء میں اس کی ایک جلد تیار کروا کے پیرس کی نمائش میں ارسال کی۔

انتہائی اہم تاریخی ماخذ ہونے کے باوجود، اس کتاب کو اب تک بوجوہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ پاکستان میں حکومتی اداروں نے متعدد فارسی کتب کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ان میں بعض کم تر درجے کے ماخذ بھی ہیں۔ پنجابی اکیڈمی کے تحت ڈاکٹر باقر نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کئی فارسی کتب، جن میں اہم ترین علی الدین کی 'عبرت نامہ' بھی شامل ہے، ترتیب و تعارف کے ساتھ شائع کیں لیکن 'چار باغ پنجاب' پنجابی اکیڈمی کی توجہ نہ حاصل کرسکی۔ قومی اور صوبائی اداروں کی عدم توجہی کے بعد خیال تھا کہ خود گجرات کے اہلِ علم حضرات فرزندِ گجرات کی اس اہم تصنیف کو سامنے لانے کی سعی کریں گے لیکن گجرات سے اس کتاب کو دشنام طرازی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس سلسلے میں، میں صرف ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ (پروفیسر ڈاکٹر) احمد حسین قریشی قلعداری

رقم فرماتے ہیں:

منشی گنیش داس وڈیرہ (وڈیہرا) کا شمار نہایت متعصب مورخین میں کیا جاتا ہے۔ ''چہار باغِ پنجاب'' لکھتے ہوئے اس نے ہندو علماء، عرفا اور ادبا وشعرا کا تذکرہ تو بڑے اہتمام سے کیا ہے مگر مسلمان اہلِ علم وفضل شخصیات کے احوال وآثار ایسے لکھے ہیں جیسے کوئی کام با امر مجبوری کیا جا رہا ہو۔ پھر بعض مسلّمہ اسلامی اقدار پر رکیک و نازیبا حملے بھی کیے ہیں جنہیں، کوئی باغیرت مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔ اصل میں یہ کتاب ہندو دانشوروں کی کتاب کہی جاسکتی ہے۔ [۱۷]

پروفیسر قریشی قلعداری کے ایک ایک لفظ سے جس طرح نفرت ٹپک رہی ہے، اس کے بارے میں ہم اپنا تبصرہ محفوظ رکھیں گے کہ نفرت اور محبت کا معاملہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ جہاں تک پروفیسر موصوف کے مبلغ علم کا تعلق ہے، اس کا محاکمہ جناب عارف علی میر اپنی کتاب 'تاریخِ جلالپور جٹاں، میں کرچکے ہیں۔ ہم صرف ایک امر کی نشاندہی کرنا چاہیں گے جس سے ان کی علمی شناوری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ انہوں نے 'چراغِ پنجاب' اور 'رسالۂ صاحب نامہ' کو منشی گنیش داس کی دیگر تصانیف میں شمار کیا ہے جب کہ یہ دونوں نام 'چار باغِ پنجاب' ہی کے دوسرے نام ہیں جن کی تشریح اوپر کہیں کی جاچکی ہے۔ سی۔اے۔ سٹوری کی کتاب 'پرشیئن لٹریچر۔ اے بائیو۔ ببلیوگرافیکل سروے میں جس کا حوالہ قریشی صاحب نے دیا ہے، اگر انہیں گنیش داس کی دیگر کتابیں قرار دیا گیا ہے تو کیا اسے درست تسلیم کرلیا جائے، جبکہ خود گنیش انہیں اپنی کتاب کے دیگر نام قرار دیتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ امر یہ ہے کہ اپنے اسی مقالے میں وہ خود اپنی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

منشی گنیش داس وڈیرہ گجرات کی قانون گو برادری کا ایک عالم وفاضل فرد تھا۔ سردار صاحب سنگھ کے زمانے ۱۷۶۵ء تا ۱۸۱۰ء کے درمیانی عرصے میں اس نے 'صاحب نامہ' کے نام سے پنجاب کی تاریخ لکھی جو 'چار باغ پنجاب' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ [۱۸]

جہاں تک پروفیسر موصوف کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ گنیش داس انتہائی متعصب ہندو مورّخ تھا جس نے بعض مسلّمہ اسلامی اقدار پر رکیک حملے کیے، جس نے مسلمانوں کے علمی اور ادبی کارناموں کو نظر انداز کیا اور ہندو علما و ادبا کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تو انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ سند کے طور پر چند مثالیں بھی پیش فرماتے جو بدقسمتی سے وہ پیش نہیں کر سکے۔

جہاں تک گنیش داس کی تاریخ نویسی کے مستند ہونے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تنقید کی کافی گنجائش موجود ہے، جو ہم اگلے صفحات میں زیرِ بحث لائیں گے لیکن پروفیسر موصوف کے الزامات بغیر کسی ثبوت کے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس مذہبی تعصب کی بات قریشی صاحب کر رہے ہیں، اس کی بدترین مثال ان کی اپنی مذکورہ بالا عبارت ہے۔

چونکہ ہمارا موضوع گجرات کی تاریخ نویسی ہے اس لیے گنیش داس نے مسلمانوں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اسے ہم ضلع گجرات تک ہی محدود رکھیں گے البتہ گنیش داس کے اقتباسات سے پروفیسر قریشی کے الزامات کی حقیقت سامنے آجائے گی:

۱۔ سب سے پہلے گنیش داس خود اپنے پُرکھوں پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بلا جھجک بیان کرتا ہے کہ اس کے بعض بزرگ مسلمان ہو گئے تھے جنہوں نے علم و ہنر کے حوالے سے کئی کارنامے انجام دیے۔

> وڈیہرا کے طور پر مشہور ہونے والی قوم کے لوگوں میں ہر ایک اپنے پیشے میں بے عیب ہوا ہے۔ جیسے نومسلم اقبال اور عبداللہ باری خوبصورت خطاطی کے لیے مشہور ہیں۔ نصرت مند شاعری اور علم موسیقی میں ہوشیار تھا۔[19]

۲۔ گجرات کے بڑے لوگوں میں سے وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا بھی ذکر کرتا ہے:

> شہر اور بڑے لوگوں میں سے نندگھن ہانڈا، جتو دھیری، گلاب رائے وڈیہرا، ہردیال مرداہا، سید فیض اللہ، سید معصوم، فتح خان پنچ، خداداد خان افغان، قاضی غلام علی، قاضی رضی الدین، میراں محمد، فاضل، تیگ سنگھ واسن، حکومت رائے بانیا اور کئی دوسرے مغل عہد میں، اپنی خوبیوں کے باعث بے مثال تھے۔[20]

۳۔ اجڑنے کے بعد جب سردار گجر سنگھ نے گجرات کو دوبارہ آباد کیا۔

اس وقت حکومت کے امراء وزراء میں دل باغ سنگھ سیال بڑا بھاگوان شخص تھا۔ لالہ رام گر کا کڑا، مہتہ بھوانی داس وڈیہرا، میاں محمد صالح، مہتہ چیت رام، مہتہ دیوی سہائے اور عصمت اللہ قانون گو بڑی نمایاں شخصیات ہیں..... آج کل مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں، ملک کے چودھریوں میں خدایار وڑائچ، خلاص خان، محمد یار گجر، فتح علی اور قانون گوؤں میں لالہ کشن روپ، خادم گنیش داس (مصنف) میاں خدایار اور رحیم بخش اونچی شان والے، مہاراجہ کے واقف کار اور سیوادار ہوئے ہیں۔[۲۱]

۴۔ حضرت شاہ دولہ اور ان کی اولاد کے بارے میں یہ اقتباس دیکھیے:

اسی طرح گجرات میں، گزرے زمانوں کی یادگار ایک پُل کنواں اور مسجد رب کے ولی حضرت شاہ دولہ کی نشانیاں ہیں۔ ان کے وصال کا سال 'باخدا پیوست' (خدا میں مل گیا) سے ۱۰۸۶ھ نکلتا ہے۔ ان کا سگا اور خداشناس بیٹا بہاول شاہ کافی عرصے تک، ان کی گدی کو زینت بخشتا رہا۔ وہ ۱۱۰۸ھ میں جنت مکانی بن گیا۔ حضرت بہاول شاہ کی دو بیویوں میں سے پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ پانچوں بیٹے، پانچ پیروں کی طرح چھوٹے بڑے لوگوں پر مہر کرنے والے تھے، سو باری باری خداپرستی کا ڈنکا بجاتے ہوئے اس فانی دنیا سے چل بسے۔ ان کی اولاد میں میاں منور شاہ اور مودی شاہ لائق اشخاص تھے۔ اس وقت میاں حسن شاہ، فضل شاہ اور جیون شاہ حضرت شاہ دولہ کی اولاد میں سے موجود ہیں۔[۲۲]

۵۔ دوسرے مسلمان فقراء کے بارے میں لکھا ہے:

اسی طرح مست درویش شاہ جہانگیر ہوئے ہیں، جو حضرت شاہ دولہ کے ہم عصر تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں بمطابق ۱۰۵۰ھ گجرات میں میاں لال اپنی کرامات کے سلسلے میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔[۲۳]

پیر محمد سچیار اولیاء کی خانقاہ نوشہرہ کی دھرتی میں تیرتھ استھان ہے، انہوں نے حضرت نوشہ، حاجی گنج بخش اولیاء سے فقر کی سوغات حاصل کی تھی۔ [۲۴]

۶۔ چند مسلمان علماء کی تعریف کرتے ہوئے گنیش داس لکھتا ہے:

نیک نام سردار صاحب سنگھ کے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے علماء میں سے ایک عالم محمد صالح ہیں۔ بہت سے مسلمانوں نے ان سے علم حاصل کیا ہے..... شعر اور نثر کے علم میں میاں محمد طفیل اور ان کا بیٹا محمد اشرف ممتاز ہیں۔ آج کل میاں محمد علی اور ان کا بیٹا محمد سلیم بڑائی کے لائق ہیں۔ محمد علی سید، جن کا تخلص مرگ تھا، کسی حد تک فارسی شاعری کے ماہر تھے، حکیم محمد قاسم حکمت اور بیماریوں کی پہچان میں بے مثال تھے۔ آنکھوں سے نابینا اور نظر نہ ہونے کے باوجود، وہ حکمت میں ہزاروں آنکھوں والے دانشمندوں سے بڑھ کر تھے۔ [۲۵]

۷۔ چند اور فقیروں کا ذکر ان لفظوں میں ملتا ہے:

سائیں لوک پانڈی شاہ نے اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کر کے بڑائی حاصل کی۔ ان کا مقبرہ گجرات میں سمت ۱۸۶۴ء بکرمی (بمطابق ۱۸۰۷ھ) تعمیر کیا گیا۔ [۲۶]

۸۔ ایک مسلمان دستکار کا ذکر دیکھیں۔

لوہار تیز دھار والی تلواریں تیار کرتے تھے۔ اس کام میں دوست محمد لوہار سب سے آگے تھا۔ [۲۷]

۹۔ ایک اور درویش کا ذکر دیکھیں:

چودھوال کے قریب حضرت حافظ حیات کی خانقاہ ہے، جو احمد شاہ کے عہد میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اس کے درویش چیلے آج تک اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کر کے صبح سویرے مسافروں کے لیے لنگر چلاتے ہیں۔ [۲۸]

۱۰۔ اس عہد کے مسلمان مقدم بھی گنیش داس سے داد وصول کرتے ہیں:

ایک اور نگر ڈنگہ ہے..... وہاں کے مقدم چودھری ولی داد نے ہر طرف سے کھتریوں اور کاریگروں کو جمع کر کے وہاں آباد کیا۔[۲۹]

چھوٹے نگر جیسا ایک گاؤں لکھنوال ہے۔ وہاں کا مقدم چودھری فتح محمد ایک بھلا مانس شخص ہوا ہے۔[۳۰]

جلال پور نگر ایک چھوٹا سا شہر ہے..... جب چودھری رحمت خان وڑائچ وہاں کا سردار بنا..... اس نے لوگوں کی دلجوئی کر کے انہیں جلالپور میں بسایا۔ خصوصاً جب سکھوں نے گجرات شہر کو برباد کیا تو اس وقت بہت سے لوگ مذکورہ چودھری کی چھتر چھاؤں میں جا کر آباد ہوئے۔ لائقِ تعریف چودھری نے..... اپنے باپ کے نام پر اسلام گڑھ کا قلعہ تعمیر کیا اور مسجد اور کنواں بنوایا۔[۳۱]

مکھووال ایک بڑا گاؤں ہے، وہیں ایک نیک شخص چودھری مبارک گزرا ہے۔[۳۲]

۱۱۔ گنیش داس بڈیہرا نے فارسی زبان کے نامور مسلمان شاعر غنیمت کنجاہی کو ان لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

کنجاہ میں غنیمت نامی شاعر رہتا تھا۔ مثنوی ''نیرنگِ عشق'' جو عزیز اور شاہد کے قصے کا بیان ہے، اس (شاعر) کے کومل خیالات کا اظہار ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں لکھی گئی۔[۳۳]

۱۲۔ کنجاہ ہی کے حوالے سے ایک ہندو کے ساتھ ساتھ ایک اور مسلمان کا ذکر ہے:

شہر کے بڑے لوگوں میں قاضی رضی الدین اور مکھن چند گزرے ہیں۔[۳۴]

تعریف کے بعد اب ہم تنقیص کے پہلو کی طرف آتے ہیں۔ ضلع گجرات کی مسلمان شخصیات کے ضمن میں گنیش داس نے صرف ایک مسلمان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، جو گنیش داس کے بیان کے مطابق لوگوں کو زبردستی مسلمان بناتا تھا۔ اگر گنیش داس نے ایک مسلمان پر تنقید کی ہے تو غلط کار ہندوؤں کو بھی نہیں بخشا۔ میری رائے میں گنیش داس نے کسی مسلمان یا ہندو پر تنقید نہیں کی، اس نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو اس کے خیال میں کسی کے ساتھ زیادتی یا معاشرتی برائی کے

مرتکب ہوئے تھے۔ دونوں فرقوں پر اس کی تنقید کے حوالے سے ہم ایک ایک مثال دیکھتے ہیں:

> سید میراں فاضل جو کٹر مسلمان تھا، ہر فرقے کے درویشوں سے بیر رکھتا اور بحث مباحثہ کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ نہ پڑھنے اور مسلمان نہ بننے کے سبب (اس نے) بلبھدر کی زبان کاٹ دی۔ اس نے قانون گوؤں اور کاریگروں کے فرقوں میں سے بہت سوں کو متاثر کر کے اور دکھ پہنچا کر مسلمان کیا۔ [۳۵]

اگر پروفیسر قریشی کا گنیش داس کی طرف سے اسلامی اقدار پر رکیک حملے کا اشارہ مذکورہ بالا اقتباس کی طرف ہے تو ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے، کیونکہ خود پروفیسر قریشی اشاعتِ اسلام میں صوفیوں اور درویشوں کے اعلیٰ انسانی کردار سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ دلچسپ بات ہے کہ اسی صفحے پر گنیش داس دو ہندوؤں کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے لکھتا ہے:

> سن ۱۰۵۵ھ (بمطابق ۱۶۴۵ء) میں موہیا نند اور سدانند ہوئے ہیں جو دونوں اگی کریا (جنتر منتر) کا علم جانتے تھے، پھر بھی ان کے دھرم کا بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ان کے مت کے مطابق شراب پینا، گوشت کھانا اور جنسی عمل کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ [۳۶]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ایک اور نکتہ بھی نکل کر آتا ہے، وہ یہ کہ گنیش کی 'چار باغِ پنجاب' محض کسی دربار کی وقائع نویسی نہیں ہے بلکہ یہ کتاب پنجاب کے مختلف اضلاع، خصوصاً گجرات کے حوالے سے ایک اہم سماجی منظرنامہ بھی ہے، جس میں ہم یہاں کی تینوں اقوام (مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں) کی ذات برادری، رہن سہن، باہمی لین دین، ان کی خوبیوں اور خامیوں، علم، ادب، صنعت، دستکاری، دیہی اور شہری پیشوں، معاشی اتار چڑھاؤ، شہروں اور قصبوں کی بربادی، ان کی دوبارہ آبادکاری، زمینوں کا بندوبست، حتیٰ کہ لوک ریت اور داستان گوئی کی تصویریں بھی دیکھتے ہیں۔ گنیش داس، گجرات اور پنجاب کا وہ پہلا مورّخ ہے جس نے تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی واقعات کو دریاؤں، دوآبوں، دیہاتوں، قصبوں، شہروں، مقدس مقامات اور لوک روایات کو انسانی زندگی کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا۔

'چار باغِ پنجاب' سے پتہ چلتا ہے کہ کنجاہ میں عمدہ پگڑیاں تیار ہوتی تھیں۔ چج دوآب

کے گاؤں حاصلاں والا میں تیلی اعلیٰ قسم کا صابن بناتے تھے۔ شادیوال کے نزدیک گاؤں کوٹلہ میں بلوریں شکر تیار ہوتی تھی۔ وہاں بالوں کا رنگ (وسمہ) بنانے کے کارخانے بھی تھے۔ ساہیوال (چج دوآب) میں اعلیٰ درجے کے سالو بنانے کی کی صنعت عروج پر تھی۔ کوٹلی آہن گراں تالے بنانے کا مرکز تھا۔ گجرات اور جلالپور اعلیٰ تلواروں کے لیے مشہور تھے۔[۳۷]

گنیش داس نے چج دوآب کے حصے میں گجرات کے حاکموں کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے، جو عہدِ اکبری سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دور تک یہاں مختلف حکومتوں کی نمائندگی کرتے رہے۔ اکبر کے عہد میں سترہ برسوں میں تین حاکم قاسم خان امیر کلاں پانچ سال تک، کبیر داس کھتری دس سال تک اور ابوالقاسم خواجہ سرا دو سال تک حکمران رہے۔ جہانگیر کے عہد میں ابوالقاسم خواجہ سرا کی حکومت مزید تین سال تک چلتی رہی۔ اس کے بعد ہربنس رائے کھتری چھ سال تک، امانت رائے کھتری پانچ سال تک، تخت مل کھتری چار سال تک اور دلاور بیگ مغل تین سال تک تعینات رہے۔ اسی طرح شاہ جہاں کے دور میں چونتیس سال تک چھ اہلکاروں نے حکومت کی، جن میں نواب علی مردان خان کا گماشتہ چار سال تین ماہ تک، مرلی رام دیوان چار سال تک، میر خان تین سال تک، رائے ہرنرین قانون گو دس سال تک، بدیع زمان چھ سال تک اور چندرسین کھتری سات سال تک گجرات کے حاکم رہے۔ اورنگزیب کے اکیاون سالہ اقتدار میں گجرات کے چودہ حاکم ہوئے جن میں صرف ایک ہندو اور ایک سکھ کے علاوہ باقی تمام مسلمان تھے۔ باقی مغل عہد اور احمد شاہ درّانی کے دور میں زیادہ تر حاکم مسلمان ہی رہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے قبل سردار گجر سنگھ اور اس کا بیٹا سردار صاحب سنگھ گجرات کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں باپ بیٹا بالترتیب چوبیس اور بائیس سال تک حکمران رہے۔ اس نصف صدی میں انہوں نے گجرات میں صرف چھ حاکم تعینات کیے جن میں ایک بھی مسلمان یا ہندو نہیں تھا۔ یہ وہی صاحب سنگھ ہے جس کے نام کی نسبت سے گنیش داس نے اپنی کتاب کا پہلا نام 'رسالہ صاحب سنگھ' رکھا تھا۔

اگلی نصف صدی میں جو مہاراجہ رنجیت سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حکومت تک چلی، گجرات کے کل سولہ حاکم مقرر ہوئے جن میں دو مسلمان، دو فرنگی اور باقی تمام ہندو یا سکھ تھے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اکبر سے شاہ جہان تک مغل بادشاہوں کا عہد مذہبی تقاضوں کی بجائے سیاسی

ضرورتوں کے تابع نظر آتا ہے۔ان کے برعکس اورنگزیب کے عہد میں ہندوؤں اور سکھوں کے عہد میں مسلمانوں کونظر انداز کیا گیا۔

اگر گنیش داس نے گجرات کے حاکموں کی محض فہرست دینے کے بجائے اس پر تبصرہ بھی کیا ہوتا تو یہ ہماری دلچسپی کا حامل ہوتا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ انگریزی دور کا حاکم گجرات ایک مسلمان میاں محمد بخش تھا جس کی شان بلکہ قصیدہ خوانی میں گنیش داس خاصا رطب اللساں نظر آتا ہے۔میاں محمد بخش کی انگنت خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد گنیش داس لکھتا ہے:

> اس کی شاعرانہ سوجھ بوجھ ستارے کو مات کرتی ہے اس کے نورانی دل کے مقابل سورج حسد سے جلتا ہے پہلی رات کا چاند اس کی کھلی ہوئی پیشانی کے مقابل قیامت تک نہیں آ سکتا جس نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، اس نے کیا دیکھا جس نے اس کی بات نہیں سنی۔اس نے کیا سنا..... یہی وجہ ہے کہ بلند اقبال اور ہندوانگلستان کے مالک انگریز اس کی سرپرستی کو دن رات اپنا دلی نشانہ بنائے ہوئے ہیں وہ اسے چند دنوں میں ہی اونچے عہدے اور بڑے رتبے پر پہنچا دیں گے کیونکہ وہ اہل اور ہوشیار آدمی ہے اور انگریزوں کا مزاج شناس ہے۔ [۳۸]

یہاں گنیش داس مورّخ کے منصب سے اتر کر ایک درباری اور قصیدہ خوان کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔اگرچہ اس سے پہلے اس کے تمام پُرکھوں نے بھی وقت کے حاکموں کی اطاعت کو ہی اپنا دین دھرم بنائے رکھا لیکن گنیش داس نے جس طرح وفاداری تبدیل کرتے ہوئے انگریزی حکمرانوں کی خوشہ چینی کی، وہ اس کے کمزور کردار پر دال ہے۔گنیش داس گجر سنگھ اور صاحب سنگھ کا نام لیوا رہا، وہ رنجیت کے عہد میں اس کا ریونیو افسر مقرر ہوا لیکن پہلی اینگلو سکھ جنگ کے دوران اس نے انگریزوں، جنہیں وہ 'صاحبانِ والاشان' کہتا ہے، کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور وقت آنے پر اس نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔'چار باغِ پنجاب' کا تین چوتھائی حصہ اگرچہ سکھوں کے بارے میں ہے لیکن سکھ جنگوں کے حوالے سے وہ سکھ فوج پر انگریزوں کے خلاف شورش کا الزام لگاتا ہے۔اپنے پُرکھوں کی طرح اس کے اندر بھی نئے حالات میں ڈھل جانے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔اس کی وفاداری صرف طاقت اور اقتدار کے ساتھ تھی، چاہے اس

اقتدار اور اختیار کی کیسی ہی نوعیت کیوں نہ ہو۔[۳۹]

اعلیٰ درجے کا سماجی مورّخ ہونے کے باوجود گنیش داس کی تاریخ نویسی میں دو مین خامیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی، جن اطلاعات کی بنیاد پر وہ تاریخ نویسی کی عمارت تعمیر کر رہا ہے، ان اطلاعات کے قابلِ اعتبار مآخذ فراہم کرنے میں وہ ناکام رہا ہے۔ نہ وہ دستاویزات اور اسناد کا حوالہ دیتا ہے نہ جدید مورّخین کی طرح ایک ہی واقعہ کے مختلف بیانات سے بحث کرتا ہے۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے اس نے انہیں سمجھا۔[۴۰]

لیکن ایک ماہرِ مالیات کے طور پر اس نے ایک نئی طرز کی تاریخ نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ انگریزی عہد میں پنجاب کے ابتدائی سیٹلمنٹ افسروں نے مقامی تواریخ کی تفصیلات، روایات، حکایات اور کسی مقام کے بارے میں ضروری کوائف کی جمع بندی کے جس کام کا آغاز کیا تھا اسے بعد میں 'رواج عام اور ضلعی گزیٹیرز لکھنے والوں نے اپنایا۔ گنیش داس کو بجا طور پر اس طرز کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً وہ گجرات یا کسی دوسرے علاقے کا ذکر چلتے چلتے نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی قدیم ترین تاریخ اور اس سے جڑے ہوئے اہم تاریخی واقعات، لوک داستانوں (جیسے سوہنی مہینوال)، مقدس مقامات اور عبادت گاہوں اور اس مقام سے متعلق پرانی اور ہم عصر نمایاں شخصیات کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔

کتاب کا اہم ترین حصہ پنجاب کا جغرافیائی، ثقافتی جائزہ ہے جس میں وہ دریاؤں، دوآبوں، دیہاتوں اور شہروں، عبادت گاہوں، مذہبی مظاہر، مختلف مقامات سے جڑی ہوئی لوک کہانیوں، عشقیہ داستانوں اور کسی خاص مقام سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کرتا ہے۔ 'چار باغِ پنجاب' میں گجرات کا جتنا بھی ذکر ہے، وہ نئی طرز کی تاریخ نویسی کے اسی تناظر میں ہے۔ گجرات سے صدیوں پرانی وابستگی کے باعث، گنیش داس کی یہ کتاب گجرات کی تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

۵۔ عمدۃ التواریخ

انیسویں صدی کی یہ فارسی تصنیف اگرچہ بنیادی طور پر سکھ تواریخ کا احاطہ کرتی ہے لیکن سکھ عہد کے حوالے سے گجرات سمیت، پنجاب کے بارے میں یہ اہم تاریخی مواد فراہم کرتی ہے۔ پانچ

دفتروں (جلدوں) اور سترہ سو صفحات پر مشتمل یہ ریکارڈ سکھ عہد کی سیاسی تاریخ کے اتار چڑھاؤ، مسلمانوں اور ہندوؤں کی صورتِ حال اور سیاسی تبدیلیوں کی باریک بیں تفصیلات سے بھرا ہوا ہے جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک روزنامچہ نویس سوہن لال سوری نے اپنی پوری زندگی لگا کر لکھا اور لاہور دربار کے خاتمے (۱۸۴۹ء) کے بعد بھی اسے اپنی موت (۱۸۵۲ء) تک جاری رکھا۔

سوہن لال سوری، گنپت رائے سوری کا بیٹا تھا، جو پہلے سردار چڑھت سنگھ اور پھر اس کے بیٹے سردار مہان سنگھ کے دربار میں وکیل کے عہدے پر فائز رہا۔ اس کا یہ عہدہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور تک جاری رہا۔ گنپت رائے سوری نے ۱۷۷۱ء سے اپنا روزنامچہ لکھنے کا آغاز کر دیا تھا جو ۱۸۱۲ء تک جاری رہا۔ اس اعتبار سے گنپت رائے نے چالیس سال سے زائد کے عرصے کا احاطہ کیا اور سردار چڑھت سنگھ، اس کے بیٹے سردار مہان سنگھ اور اس کے بیٹے مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۸۱۲ء تک) کے دورِ اقتدار تک کے واقعات کو اپنے روزنامچے کا حصہ بنایا۔ سردار گنپت رائے کی خدمات کو تینوں سرداروں نے بے حد سراہا اور جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے سب سے بڑے بیٹے سوہن لال سوری کو اس عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔ سوہن لال سوری نے کم و بیش اتنے ہی برس یعنی ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۲ء تک ہر روز کے واقعات کو قلم بند کرنے کا فریضہ انجام دیا جس کے نتیجے میں ایک ہزار سات سو صفحات پر مشتمل 'عمدۃ التواریخ' فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور پنجابی تراجم کی صورت میں ہماری دسترس میں ہے۔

'عمدۃ التواریخ' پنجاب کی نہیں بلکہ سکھ سرداریوں اور بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تحت لاہور دربار کے عروج و زوال کی تاریخ ہے جس میں گجرات کی بھنگی مثل اور اس علاقے پر رنجیت سنگھ کے کنٹرول کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ بھنگی مثل کے حوالے سے گجر سنگھ، اس کے بیٹے صاحب سنگھ اور صاحب سنگھ کے بیٹے گلاب سنگھ کی باہمی شورشوں کا مرکز گجرات اور اس کے اردگرد کے علاقے جلال پور، اسلام گڑھ اور بجوات وغیرہ تھے۔ پہلے گجر سنگھ اور اس کے بیٹے صاحب سنگھ کے درمیان تصادم چلتے رہے۔ بعد ازاں رنجیت سنگھ کے اقتدار میں آنے کے بعد صاحب سنگھ اور اس کا بیٹا گلاب سنگھ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے۔ گلاب سنگھ مدد کے لیے سرکار (رنجیت سنگھ) کے پاس پہنچ گیا۔ رنجیت سنگھ باپ کے خلاف بیٹے کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے خلعت سے نوازا اور رخصت ہوتے وقت اسے اس کی 'جاگیریں' دلانے کا یقین دلایا۔ یہ

باپ اور بیٹے کے درمیان اختلافات بڑھانے کے مترادف تھا۔ رنجیت سنگھ کی شہ پر گلاب سنگھ نے جلال پور اور اس کے اردگرد اشتعال انگیزیوں اور قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تصادم سے بچنے کے لیے صاحب سنگھ نے اپنے بیٹے گلاب سنگھ کو جلال پور، لکھووال اور بھاگووال حوالے کر دیے لیکن گلاب سنگھ نے اسلام گڑھ کی حوالگی کا بھی مطالبہ کر دیا۔[۴۱]

سترہ سو صفحات میں پھیلی ہوئی اس کتاب میں موجودہ ضلع گجرات کے تمام چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور دیہات کے بارے میں اہم تاریخی تفصیلات ملتی ہیں۔ لاہور دربار یا رنجیت سنگھ کے اقتدار کے دور میں یہ علاقہ مختلف سیاسی سرگرمیوں کا مرکز نظر آتا ہے۔ مہاراجہ نے اس علاقے کے چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں متعدد دورے کیے جن سے اس علاقے سے رنجیت سنگھ کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

'عمدۃ التواریخ' کا پہلا دفتر گورونانک کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور تمام گوروصاحبان سے ہوتا ہوا احمد شاہ درّانی کے حملوں پر تمام ہوتا ہے۔ یہ حصہ سوہن لال کے والد نے لکھا تھا اور یہ روزنامچے کی صورت میں نہیں تھا۔ دوسرا دفتر مہاراجہ رنجیت کے دادا سردار چڑھت سنگھ، باپ سردار مہان سنگھ اور خود مہاراجہ کے دور ۱۸۳۰ء تک آتا ہے جس میں گوروصاحبان اور اہم سکھ مثلوں بھنگی، رام گڑھیا، آہلووالیا اور شکیر چاکیہ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔ بھنگی مثل کے حوالے سے گجرات کی سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ تیسرے دفتر کے پانچ حصے ہیں جو ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۹ء تک رنجیت سنگھ کے آخری دورِ اقتدار کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس حصے میں بھی گجرات، جلال پور، کنجاہ، رام نگر اور کئی دیگر قصبوں کے حوالے سے اہم سیاسی واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تیسرا دفتر پانچ ذیلی حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ چوتھا دفتر جو تین ذیلی حصوں پر مشتمل ہے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۵ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح پانچواں دفتر ۱۸۴۹ء پر تمام ہوتا ہے یعنی جب پنجاب پر انگریزی قبضہ مکمل ہو گیا۔ چوتھے اور پانچویں دفتر کے بڑے حصے اینگلو سکھ جنگوں کی تفصیلات سے عبارت ہیں۔ اس اعتبار سے یہ گجرات کی شورش کی تاریخ بھی ہیں۔ چیلیانوالہ میں، جہاں برطانوی فوجیوں کی قبروں کی یادگار موجود ہے، تاریخِ گجرات کا وہ باب ہے جس پر پنجاب کی شکست اور غلامی کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ یوں اپنی تاریخ کے اعتبار سے گجرات ہماری غلامی کا نقطۂ آغاز بنتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ گجرات کے انتظامی معاملات اور

سرحدوں کے تعین کے ضمن میں مشہور فقیر خاندان کے فقیر الدین کا ذکر بھی آتا ہے۔ 'عمدۃ التواریخ' کے مطابق وہ گجرات کی صوبہ داری پر تعینات کیے گئے تھے۔

'عمدۃ التواریخ' جہاں سیاسی واقعات کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے وہیں سماجی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ سیاسی طور پر بھی اس کی وقعت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب ہم اینگلو، سنگھ جنگوں سے قبل اور بعد کے روزنامچوں کا تقابل کرتے ہیں تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جنگ کے بعد کے روزنامچے مختصر ہوتے چلے گئے ہیں اور لاہور دربار میں مہاراجہ کی جگہ انگریز ریذیڈنٹ کا ذکر بڑھ گیا ہے۔ حضورِ والا (مہاراجہ) کی جگہ 'صاحب خان بہادر' کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے اور 'سرداروں' کی جگہ 'اہلیانِ کونسل' نے لے لی ہے۔

۶۔ عبرت نامہ

مفتی علی الدین کی فارسی تصنیف 'عبرت نامہ' پنجاب کے جغرافیائی حالات، تاریخ، سماجی واقعات اور ہنر و فن کے حوالے سے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی تاریخِ تصنیف ۱۳ ستمبر ۱۸۵۴ء ہے اور اس کا واحد قلمی نسخہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ اس کی باضابطہ اشاعت پاکستان میں پنجابی ادبی اکیڈمی کے ڈاکٹر باقر نے ۱۹۶۱ء میں کی۔ 'عمدۃ التواریخ' کی طرح اس کی ایک نقل بھی پیرس کی آرٹ اور انڈسٹری کی نمائش میں بھیجی گئی تھی۔[۴۲]

مصنف مفتی علی الدین کے والد مفتی خیر الدین لاہور کے رہنے والے تھے لیکن ۱۸۲۳ء میں سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر لدھیانہ منتقل ہو گئے۔ مفتی علی الدین کے مطابق:

> میں ۱۸۲۳ء میں والد مرحوم کے ساتھ اپنے آبائی شہر لاہور سے سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر لودیانہ (لدھیانہ) پہنچا۔ پھر فیروز پور، لودھیانہ، بہاولپور، سندھ، مارواڑ، ملتان، ڈیرہ جات پنجاب، ہزارہ، کشمیر، پشاور، درۂ خیبر، کابل تا حدود غزنی و بامیان (انگریزوں کی) خدمات انجام دیتا رہا اور اسنادِ خدمت گزاری حاصل کیں..... گذشتہ لوگوں نے سکھوں کی تواریخ لکھی ہیں مثلاً لالہ سوہن لال سکنہ لاہور نے اس ضمن میں کتاب لکھی ہے جو بہت مفصل ہے اور (مصنف) اکثر مقامات پر حقیقت سے

دور رہا ہے۔ نیز لودھیانہ کے بوٹے شاہ نے کتاب تحریر کی جو رنگینیِ فقرات کے باوجود تطویل کلام کے باعث مطالب مہمل ہیں پس 'عبرت نامہ' سے بڑھ کر کوئی عمدہ کتاب نہیں ہوسکتی جو پنجاب کے حدودِ اربعہ اور ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم، دریائے لنڈی اور اباسین، نیز نہروں کے ذکر پر مشتمل ہے، مزروعات کی اقسام، معدنیات، نباتات، وحوش وطیور، رسوم اہلِ اسلام، ہنود اور سکھ، تینوں گروہوں کے فقرا، بنائے قصبہ جات، آغاز حکومت سکھ کا حال بیان ہوا ہے جس کی فرمائش کرنل سی۔ ایم۔ ویڈ ایجنٹ لودھیانہ نے کی تھی۔ [۴۳]

ہمارے موضوع یعنی گجرات کی تاریخ نویسی کے حوالے سے بھی اس کتاب میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔ دوآبہ رچنا، دوآبہ چنہت (چج)، دریائے چناب، ان دوآبوں اور دریاؤں سے وابستہ نہروں، قلعوں، شہروں، پیداوار، آبادی اور رسوم و رواج کی تفصیلات اس ضمن میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ سیاسی حوالوں سے سکھوں کی شورش اور سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگوں خصوصاً جنگ رام نگر کی کیفیت ایک ہم عصر شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوآبہ رچنا اور دوآبہ چنہت (چج) کے بعض شہروں اور آبادیوں کے حوالے سے چند اقتباسات پیش کیے جائیں:

> شہر رسول نگر جسے رنجیت سنگھ رام نگر کہا کرتا تھا، معروف ہے۔ سید نگر اور احمد نگر دریائے چناب کے کنارے آباد ہیں۔ چوہدری پیر محمد زمیندار جٹ اور علی محمد، سید محمد اور احمد خان نے سلاطینِ دہلی کے زمانے میں (یہ قصبے) اپنے نام پر آباد کیے اور (انہیں) سکھوں کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ احمد شاہ کے زمانے میں یہ پرگنہ لاہور کے مالیہ گزار تھے، چونکہ یہ قصبات مہاراجہ کے دادا سردار چڑھت سنگھ کے دارالحکومت کے نزدیک تھے، اس لیے سردار مذکور ان جگہوں میں لوٹ کھسوٹ کرتا رہتا تھا۔ یہاں کے جٹ، حسبِ مقدور ان سے خوب لڑتے رہے، چنانچہ پورے پنجاب میں ان (جٹوں) کی طرح کوئی قوم شجاعت و دلیری میں سکھوں کا مقابلہ نہیں

کرسکی۔ بعد میں نظام الدین خان اور قطب الدین خان نے مہاراجہ سے دو تین جنگیں لڑیں۔ مختصر قصہ یہ کہ سردار چڑھت سنگھ دن رات کی لڑائیوں کے باوجود اپنے مقبوضہ ملک پر حاکم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد سردار مہان سنگھ نے رسول نگر کو رام نگر کے نام سے موسوم کیا اور گوجرانوالہ کی طرح اپنا دارالحکومت بنالیا۔ سردار مذکور کے ماموں سردار دَل سنگھ نے علی پور کو اَکال گڑھ کا نام اور اپنا دارالحکومت بنالیا۔ اس وجہ سے ان مقامات کی آبادی زیادہ ہوگئی۔ آج یہ دونوں مقامات اپنے بانیوں کی نسبت زیادہ آباد ہیں'۔[۴۴]

جلال پور اور گجرات کے حوالے سے لکھا ہے:

گجرات آباد شہر ہے۔ اسے اکبر نے آباد کیا تھا۔ اردگرد اور نیچے قلعہ بنوایا جس میں حاکمِ شہر سکونت رکھتا تھا، یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر جلال پور کا قدیم شہر ہے۔ پہلے خوب آباد تھا، درمیان میں ویران ہوگیا جس دن سے اس کے ایک باشندے دیوان محکم چند نے اپنے دورِ اقتدار میں باغ، تالاب اور بلند عمارات بنوائیں، اس کی آبادی بہت بڑھنا شروع ہوگئی۔[۴۵]

مفتی علی الدین بھی اپنے پیش روؤں بوٹے شاہ، گنیش داس اور لالہ سوہن لال سوری کی طرح انگریز حکمرانوں کے خوشہ چیں تھے، تاہم 'عبرت نامہ' سکھوں کے حوالے سے تلخ نوائی کے باوجود کافی حد تک مذہبی تعصب سے پاک ہے۔ افسوس کہ اس بیش قیمت تاریخی ماخذ کا ابھی تک انگریزی یا اردو ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ پنجابی ادبی اکیڈمی نے محض فارسی متن کی اشاعت کو ہی کافی تصور کیا۔ اسی سبب سے یہ اہم ماخذ، ہمارے تاریخ نویسی کے باب میں بری طرح نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔

مذکورہ بالا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی مآخذ معروف اور قابلِ رسائی ہیں جن سے گجرات کی تاریخ نویسی کے حوالے سے کافی مدد لی جاسکتی ہے لیکن اصل کام وہ مآخذ ہیں جن کی ابھی تک نشاندہی نہیں ہوسکی اور جن کی تلاش و جستجو کے بغیر گجرات کی تاریخ میں موجود خلاء پُر نہیں کیے

جاسکتے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے سے معروف اور موجود مآخذ اردو یا انگریزی تراجم کی صورت میں دستیاب کیے جائیں اور گجرات یونیورسٹی ایسے طلبا و طالبات اور محققین کی حوصلہ افزائی کرے جو اس حوالے سے موجودہ کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ پرکاش ٹنڈن (ترجمہ: رشید ملک) پنجاب کے سو سال، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۹۵

۲۔ کیپٹن اے۔سی۔ایلیٹ (ترجمہ و اضافہ شاہین مفتی)، گجرات: عہد بہ عہد، گجرات، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۷

۳۔ عارف علی میر، تاریخ جلال پور جٹاں، گجرات، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۴۸

۴۔ میر وارث علی سیفی، واقعاتِ درّانی، پنجابی ادبی اکادمی، لاہور، ۱۹۶۳ء، پیش لفظ، ڈاکٹر محمد باقر۔

۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۲

۷۔ ایضاً، پیش لفظ ڈاکٹر محمد باقر

۸۔ بوٹے شاہ، (ترجمہ منشی بہلول)، پنجاب دی جغرافیائی تواریخ، لاہور، ۲۰۰۰ء (اوّلین اشاعت، لدھیانہ مشن پریس، ۱۸۵۰ء)، صفحہ ۱۱

۹۔ ایضاً، صفحات ۱۱۲۔۱۱۳

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۴

۱۱۔ Kirpal Singh, 'Charbagh-e-Punjab, by Ganesh Das', *Proceedings of Punjab History Conference*, Punjabi University, Patiala, p.119

۱۲۔ *Ibid.*, p.121

۱۳۔ Ganesh Das (translated and edited by J.S. Grewal & Indu Banga, *Early Nineteenth Century Punjab*, G.N.D. University, Amritsar, 1975, p.13

۱۴۔ *Ibid.*, pp.13-14

۱۵۔ *Ibid.*, p.14

۱۶۔ احمد حسین قریشی، قلعداری، احوال و آثار گجرات، مشمولہ گجرات عہد بہ عہد (ترجمہ و اضافہ ریاض مفتی)، گجرات، جولائی ۱۹۹۷ء، صفحہ ۸

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ گنیش داس (مدیران جے۔ایس گریوال، اندو بنگا، مترجمین امرونت سنگھ، موہن جیت سنگھ)، انیسویں صدی دا پنجاب۔ چار باغِ پنجاب وچوں، لاہور، ۲۰۰۵ء، صفحہ ۵۵

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۵۵

۲۱۔ ایضاً، صفحات ۵۶۔۵۵

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۵۷

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۵۸

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۸

۲۵۔ ایضاً، صفحات ۵۹۔۵۸

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۵۹

۲۷۔ ایضاً، صفحہ ۶۰

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۹۹

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۰

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۲

۳۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۳

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۵۸

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ Ganesh Das (translated and edited by J.S. Grewal & Indu Banga, *Early Nineteenth Century Punjab*, *op.cit.*, p.33

۳۸۔ گنیش داس (مدیران جے۔ایس گریوال، اندو بنگا، مترجمین امرونت سنگھ، موہن جیت سنگھ)، انیسویں صدی دا پنجاب۔چار باغِ پنجاب وچوں، محولہ بالا، صفحات ۹۳۔۹۴

۳۹۔ Kirpal Singh, *op.cit.*, p.121

۴۰۔ *Ibid.*, p.124

۴۱۔ Sohan Lal Suri (tr.V.S.Suri) Umdat-ut-Tawarikh, Dafter II, G.N.D. University, Amritsar, 2002, pp.80-81

۴۲۔ مفتی علی الدین، عبرت نامہ (ترتیب و تدوین ڈاکٹر محمد باقر)، لاہور، ۱۹۶۱ء، انگریزی تعارف، صفحہ ۷

۴۳۔ ایضاً، دیباچہ مصنف

۴۴۔ ایضاً، صفحات ۹۸۔۹۹

۴۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۰